لہو کے چراغ

انجم اعظمی

لہو کے چراغ

انجم اعظمی

نقش اوّل ایک ہزار

مطبوعہ مشہور پریس کراچی

جنوری ۱۹۶۱ء

ملنے کا پتہ

کراچی آرٹ اکیڈیمی

معرفت انٹرنیشنل بک ڈپو۔ مشن روڈ۔ کراچی

انتساب

مادرِ درس گاہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، کے نام

آبیاری جو کروں خونِ جگر سے فن کی

کیوں غلط ہو بھلا اندازۂ شہرت اپنا

ترتیب

ب۔ غزلیں

حرفِ اوّل

تقسیم ہند کے بعد اچانک ادب کے نقادوں نے ہمیں یہ بتانا شروع کیا کہ ادب و شعر کا یہ نیا دور جمود کا دور ہے۔ بد قسمتی سے میں اسی دورِ جمود کی پیداوار ہوں اور ڈرتے ڈرتے اپنی شعری تخلیقات کو یکجا صورت میں پیش کر رہا ہوں کہ شاید ادب کے کسی نقاد کو اس میں کہیں کوئی بات ایسی مل جائے جو میری ادبی زندگی کا سہارا بن جائے۔

میرا پہلا مجموعہ محبّت کی نظموں پر مشتمل تھا جو "لب و رخسار" کے نام سے ۵۲ء میں علی گڈھ سے شائع ہوا۔ جس کی وقتی پذیرائی میرے لئے ایک افسانہ بن چکی ہے۔ آٹھ سال کے بعد میری یہ دوسری کوشش ہے جس کے ذریعہ میں اپنے فنی تجربات کو اردو کی شعری روایات کا ایک حصہ بنتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس میں فن کی ہزار خامیاں ہوں گی جن کا مجھے اعتراف ہے لیکن اگر فن کے نقاد اسے پڑھ کر میرے مستقبل سے امید باندھ سکیں گے تو سمجھوں گا کہ میں ارتقا کے منازل سے برابر گذرتا رہا ہوں۔

اس مجموعے میں جو تخلیقات شامل کی گئی ہیں ان میں سے بعض زندگی کے مختصر لمحات کے تاثرات پر مبنی ہیں اور بعض کا تعلق میرے آدرش اور زندگی کے پیچیدہ مسائل سے ہے۔ متنوّع موضوعات کو برتتے ہوئے میں نے ہیئت کا استعمال آزادانہ طور پر کیا ہے اور کسی نظم کے لئے کوئی مخصوص ہیئت شعری شعوری طور پر اپنانے کے بجائے موضوع کو اس کے فطری انداز میں ڈھلنے دیا اسی لئے پابند نظموں، غزلوں اور رباعیات کے ساتھ ساتھ آزاد اور معرّیٰ نظمیں میرے مجموعے میں کئی ہیں جن کے لئے شاعری کے قدیم اسکول والوں سے معذرت خواہ ہوں لیکن مجھے توقع ہے کہ نیا ذہن میری ان نظموں کو نظر انداز نہ کر سکے گا۔

میرے خیال میں شعر وادب کی دنیا میں کوئی دعویٰ کام نہیں آتا بلکہ زندگی جب تک

فن کی عبادت نہ بن جائے کسی منزل کا ہاتھ آنا مشکل ہی ہے۔ نئے نئے موضوعات کی

تلاش برائے بیت میرے نزدیک ایک شوق فضول ہے۔ آرٹ میں حسن اور عظمت اس وقت

پیدا ہوتی ہے جب زندگی اور شاعر کے درمیان گہرے ربط کی بنا پر موضوعات خود بخود

سامنے آجاتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ شاعرانہ عظمت کے سلسلہ میں بیسویں صدی کی اردو شاعری

کا تذکرہ جب بھی ہوتا ہے بعض اہل ذوق اقبال کا نام پیکر بس کر دیتے ہیں۔ اس میں شک

نہیں کہ اقبال کی عظمت اردو شاعری میں ایک بلند چوٹی کی حیثیت رکھتی ہے اور اگر کوئی

شخص اس چوٹی پر کھڑا ہو کر نئی شاعری کی طرف نگاہ اٹھائے تو اسے ہر چیز

حقیر معلوم ہوگی لیکن یہ حقارت کی نگاہ اگر نئی شاعری کا تجزیہ نہ کر سکے تو الزام بہر حال

اسی پر عائد ہوگا۔ اس سلسلے میں کئی اہم باتیں ذہن میں رکھنی ہوں گی۔

اقبال کو یہ عظمت دو ایک دن میں حاصل نہیں ہوئی۔ یہ ان کی ساری زندگی کی

کمائی ہے اس لئے دوسروں کو بھی ساری زندگی کام کر لینے دیجئے اور جدید شعراء کے فن کے

تدریجی ارتقا پر نگاہ رکھئے۔

(۲) اقبال کے علاوہ بیسویں صدی کے دوسرے شاعر شاعری کے دوسرے رخ رکھتے

ہیں اور ان کی کمی علامہ اقبال کی شاعری سے بھی پوری نہیں ہو سکتی

(۳) نئے شعرا اپنا مزاج لے کر آئے ہیں۔ یہ مزاج انھیں زندگی کی نئی قدروں سے ملا ہے

جن کی کمی آج سے تیس سال پہلے کا بڑے سے بڑا شاعر پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہمیں اقبال

کی عظمت کا قائل ہوتے ہوئے بھی نئی شاعری کے رنگ و آہنگ کو سمجھنا ہوگا۔

(۴) نئی شاعری میں آئے دن جو فنی تجربات ہو رہے ہیں اور جن کے سہارے ہمارا

شعری ادب ایک ایک قدم آگے بڑھتا جا رہا ہے یہی ہمیں ایک نئی عظیم الشان چوٹی تک پہنچائیں گے

ورنہ اقبال کے عظیم ہونے کے باوجود جدید کلچر کی ترجمانی سے ہم محروم رہیں گے اور آئندہ ای

ساری نسلیں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہ جائیں گی۔

یہی اسباب ہیں جو ہر مخالفت کو برداشت کر لیتے اور کبھی کبھی اپنے ہمچشموں سے خراج تحسین وصول کر کے نئے جوش و خروش سے کام کرنے پر آمادہ کرتے رہتے ہیں۔

چند سالوں سے ادب میں ایک نئی بحث چھڑ گئی ہے جو ادیبوں اور شاعروں پر کچھ اچھا اثر نہیں ڈالتی۔ بعض اصحاب فکر کی رائے ہے کہ پہلے انسانیت کا رہنما ادب تھا اور اب رہنمائی سائنس اور ٹکنالوجی کے ذمے ہے۔ دوسرے اس دور کے بہترین دماغ عموماً ملکی کارکردگی اور ٹیکنالوجی کی طرف جا رہے ہیں۔ مجھے بعض وجوہ کی بنا پر ان دونوں باتوں سے اتفاق نہیں جہاں تک زندگی کی رہنمائی کا سوال ہے ماضی میں اس کی باگ ڈور مذہب کے ہاتھ میں تھی اور اب سائنس کے ہاتھ میں ہے۔ ادب و شعر کے ذمے ہر دور میں زندگی کی جمالیاتی اور تہذیبی اقدار کی پرورش ہی رہی ہے اور یہ خدمت ادب کو آج بھی انجام دینی ہوگی۔ اس کے علاوہ دنیا کے تمام بہترین ذہن ہرگز وہ نہیں ہیں جو ملکی کارکردگی اور ٹکنالوجی کی طرف مائل ہوتے ہیں بلکہ ان میں چند کا رجحان اس طرف ہوتا ہے اور بیشتر تخلیقی کاموں کی طرف مائل ہوتے ہیں جن کے تخلیقی جوہر کا اظہار سائنس، فلسفہ اور فن میں یکساں ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس تسلسل کا تعلق زندگی کے تنظیمی تسلسل سے ہے۔ البتہ آج کے فن کو سائنسی حقائق کی روشنی میں مرتب کرنا ہوگا تاکہ وہ جدید دور کے تقاضوں کو پورا کر سکے

میں جب یہ دیکھتا ہوں کہ اس دور جمود میں اردو ادب میں کیسی کیسی بیش بہا تخلیقات کا اضافہ ہوا تو نقادوں کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ "نقش فریادی" کا مصنف دو اور مجموعے ترتیب دے کر ملک کا ایک وقیع شاعر بن گیا۔ انگریزی ادب کی ایک ذہین طالبہ اپنے تین ناولوں کی اشاعت کے بعد اس دور کی نمائندہ ناول نگار بن چکی ہے اور دوسرے مشہور و معروف ناموں کے علاوہ کتنے ہی نئے نام ابھر آئے ہیں جنھیں شاید ادب کا کوئی سنجیدہ طالب علم نظر انداز نہ کرے۔ تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دور انقلاب کو دور جمود کے نام سے کیونکر یاد کیا جائے

جس کی رفتار آہستہ مگر کتنی تیز ہے جو ہمارے لئے یقینی طور پر ایک شاندار مستقبل کی بشارت ہے۔

یوں تو شاعر اور ادیب کو ہر سماج میں رہنے اور زندگی گذارنے کا حق حاصل ہے لیکن اس کو یہ حق آج تک نہیں ملا۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ دنیا میں اس کے علاوہ اور لوگ بھی اپنے حقوق سے محروم ہیں لیکن اس محرومی کا تقاضا ہے کہ شاعر زندگی کو آنکھیں کھول کر دیکھے اور سمجھے اور نئی زندگی کے تصور اور نئی اقدار کے جن سے اپنی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگا کر ذہن میں اس احساس جمال کو بیدار کرے جس میں زندگی کی گہرائی اور حزن ہو۔

آرٹ کے سلسلہ میں ایک بات یاد آرہی ہے کہ علم اور عقل سے بھی بڑی ایک چیز انسان میں موجود ہے جو ظرف کہلانے کی مستحق ہے۔ یہ ظرف زندگی کی بصیرت سے پیدا ہوتا ہے اور شخصی ضبط و توازن کا نتیجہ ہوا کرتا ہے جو ایک آرٹسٹ کے لئے پہلے اور آخری اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا آرٹ بہرحال اس کے ظرف کا پیمانہ ہوتا ہے۔ اس کسوٹی پر اس کی انفرادیت کو پرکھا جاسکتا ہے۔

مجھے اپنے متعلق صرف ایک بات کہنی ہے کہ جس گھڑی میں نے ادب و شعر کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا میرے ذہن میں انسانیت کا ایک تصور، قومیت، مذہب، نسل اور رنگ کے امتیازات سے بلند موجود تھا اگر اس تصور کا ہلکا سا عکس بھی آپ کو میری شاعری میں نظر آجائے تو مجھے اپنی محنت اکارت جاتی نہیں معلوم ہوگی۔

اس مجموعے پر میں نے کسی مشہور نقاد سے دیباچہ لکھوانا ضروری نہیں سمجھا لیکن اب اس کا خواہاں ہوں کہ نقادان فن اس کے متعلق مجھے اپنی صحیح اور گراں قدر رائے سے نوازیں تاکہ میں ان کے مفید مشوروں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکوں۔ چونکہ فن کوئی ذاتی چیز نہیں ہے بلکہ سماجی حیثیت رکھتا ہے اس لئے میں اس تعاون اور اشتراک کی اپنے وطن کے نقادوں

سے پوری توقع رکھتا ہوں۔

نامناسب ہوگا اگر آخر میں ضیاءالدین صاحب کا تذکرہ نہ کروں جو ادب وشعر سے متعلق اپنے قیمتی مشوروں سے میری رہنمائی کرتے رہے ہیں اور مجھ میں فارسی اور انگریزی شاعری کے مطالعے کا صحیح مذاق پیدا کیا۔ اس کے علاوہ میں شکیل احمد ضیا، سحر انصاری ـــــ اور عبدالرحمٰن قریشی کے خلوص، جد وجہد اور اشتراک کو فراموش نہیں کرسکتا جس کے بغیر اس کتاب کی اشاعت تقریباً ناممکن تھی۔

انجم اعظمی

۱۰ راگست ۱۹۶۰ء

۱؎ کچھ عرصے پہلے وزارت تعلیم پاکستان میں اسسٹنٹ ایجوکیشن ایڈوائزر تھے۔ آج کل محکمۂ امور اقتصادیات میں ملازم ہیں

نظمیں

سنہ ۵۰ء تا سنہ ۶۰ء

مشرق

شراب ہو تو جہاں بھر کا درد ہو اس میں
ترے حدود نہ ہوں اے نظامِ خود نگری

پلا دے بادۂ مشرق جو کوئی رند ملے
کہ اہلِ درد بھی رکھتے نہیں یہ بے خبری

مآلِ غم بھی سناتے ہیں ایشیا والے
سنا ہی کرتے ہیں یوں تو حدیثِ بال و پری

یہ ہو رہی ہیں انھیں عاشقوں کی جرأت سے
نگار خانۂ ہستی میں آج نقش گری

کماں سے تیر چلے آسماں کو زد میں لئے
زمیں کو گود میں لے کر چلی جواں نظری

بلندیاں ہیں تو کیا پست ہو سکیں گی کبھی
نہ کوئی دیر و حرم ہے نہ کوئی فتنہ گری

یہ اضطراب، یہ قلب و نظر کے ہنگامے
یہاں حرام ہوئی جا رہی ہے کم نظری

سوادِ منزلِ جاناں انھیں کو راس آیا
بسا رہے تھے جو اب تک مقامِ رہگذری

علی گڑھ — سنہ ۵۱ء

خواب کے محل

صبح بیت جاتی ہے شام بیت جاتی ہے
اپنے سوکھے سوکھے لب مسکرا نہیں سکتے
ان حسین راتوں میں زندگی مچلتی ہے
ان حسین راتوں کی تاب لا نہیں سکتے
حسن و عشق کی باتیں ہم پہ طنز کرتی ہیں
زخم جان اور دل کے ہم چھپا نہیں سکتے
خواب کے محل سونے، عیش کا جنوں پھیکا
کیف اور مستی کے گیت گا نہیں سکتے

لیکن ان فضاؤں میں آج رقص ہوتا ہے
حوصلوں کا جذبوں کا خانماں خرابوں کا!
آسماں کے تاروں کا، درد و غم کے ماروں کا
عشق کے شراروں کا، آہنی غباروں کا!
کوہ و دشت و صحرا میں پھول کھلنے والے ہیں
آج وادی وادی میں شوق کا بسیرا ہے!
زندگی کے دامن میں موج نور رقصاں ہے
موت کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا ہے

اب غبار چھٹتا ہے، اب فضائیں نکھریں گی
اب شفق کے پردے میں اک نیا سویرا ہے
اک نئی زمیں ہوگی، آسماں نیا ہوگا
ایک ایک ذرّے کے حُسن کو سنورنا ہے
خونِ دل سے نکھرے گا یہ دیارِ بے رونق
زندگی کے متوالو ڈوب کر ابھرنا ہے

علی گڈھ...... ۵۰ء

ہم سے دیکھے نہیں جاتے یہ غمِ زیست کے داغ
اے جنوں ہم بھی جلائیں گے محبت کے چراغ

اشعرؔ کی موت[1]

غم نے پھر لی ہے نئی انگڑائی
یہ مری روح کے مرجھائے ہوئے پھول نہیں کھل سکتے

موت کے آہنی ہاتھوں کا یہ جلتا ہوا لمس
کہکشاں ٹوٹ گئی ہو جیسے
کس کی سوغات ہے یہ داغ مرے سینے کا

روشنی تیز ہوئی جاتی ہے ایوانوں کی
پھر وہی قہقہے گونجے ہیں فضاؤں میں یہاں
جن سے سو بار ہوا ہوں زخمی
جن سے پہلے بھی مرا سینہ ہوا ہے چھلنی
جن سے سو بار تو نفرت کی ہے۔

مفلسی ہاتھ میں اک نور بھرا جام لئے آئی تھی
رات کے ہاتھ میں ہوں چاند کے شہپر جیسے

[1] اشعر ملیح آبادی مرحوم۔ علی گڑھ کے دوست جن کی جواں مرگی کا سب سے بڑا سبب ان کی مفلسی تھی۔

یا کسی گوشۂ تاریک میں اک چہرۂ انور جیسے
لیکن اس نور بھرے جام نے دم توڑ دیا
آج وہ نور بھرا جام نہیں
آج وہ سرخوش انجام نہیں
سوگوارانہ ہے پھر آج محبت کی کرن
مفلسی روتی ہے پھر خون کے آنسو اکثر
تم نہیں ہو تو تمہارا یہ جہاں تنہا ہے

تم نہیں ہو تو تمہارا یہ جہاں تنہا ہے
لیکن اب درد تو بڑھتا ہی چلا جائے گا
تم نہیں ہو تو محبت کے دیئے کیا ہوں گے
ہم بھی جل جائیں گے، مر جائیں گے
قصر بیداد کی بنیاد مگر ڈھا دیں گے
پھر یہاں موت کبھی وقت سے پہلے تو نہیں آئے گی

علی گڑھ........ ۵۰ء

حسرت بھری نگاہ محبت بھری نگاہ
دونوں سے تیز تر ہے عداوت بھری نگاہ

طوائف

زرد رخساروں پہ عکسِ دلِ خونبار لیے
اپنے ماحول کا ٹوٹا ہوا پندار لیے
تلخیٔ عشرتِ اغیار کا گلزار لیے
کوئی کہتا ہوا آیا ہے مری دنیا میں
میرے ان ہونٹوں کو اب پیار نہیں مل سکتا

دامنِ عصمتِ مریم میں بھی وہ تار نہیں
جو ترے دامنِ صد چاک کو سی سکتا ہو

ہونٹ ہنس دیتے ہیں آنکھیں بھی تو بجھ جاتی ہیں
کوئی آتا ہے، قدم چوم لیے جاتے ہیں
زلفِ شب رنگ کا پھر بھی کوئی سودائی نہیں
طنز ہی طنز ہے اس حسن میں اس شوخی میں

تو گنہ گار نہیں، کوئی جفا کار نہیں
پھر بھلا کون ہے اس پردۂ زنگاری میں؟

علی گڑھ...... سنہ ۵۱ء

شاعرِ مشرق کے نام

مستیٔ کون و مکاں حافظؔ شیراز کی پابند نہیں
دہر پر چھائے گی، ہر روح میں گھل جائیگی

مردِ مومن کی حکایات سنا کر تو نے
میرے خوابوں کو کوئی درس دیا ہے لیکن
میرے خوابوں کی یہ تعبیر نہیں ہو سکتی

آج نظروں میں کوئی اور جہاں رقصاں ہے
آج ہاتھوں میں نئے دور کا پیمانہ ہے!
مردِ مومن تو اسی دہر کا افسانہ ہے

میرے نغموں میں تری شوخیٔ افکار تو مل سکتی ہے
لیکن اے شاعرِ مشرق!
میرے سینے میں کوئی سنگ گراں آج نہیں
میرے نغموں میں ابھی میرا جنوں ڈھلتا ہے
نئے انساں کی محبت کا فسوں ڈھلتا ہے
انھیں نغموں سے ابھی وادی و گلزار کو مہکانا ہے

اور جب گردشِ ایّام بدل جائے گی
اور جب رات نئی صبح میں ڈھل جائے گی
میں انھیں نغموں سے پھر ساغرِ جمشید بھی چھلکاؤں گا
در و دیوار پہ خیّام کی زلفوں کو بھی لہراؤں گا

علی گڈھ سنہ ۵۰ء

امن

یہ جنگِ زرگری کب ختم ہوگی
جدھر دیکھو ادھر ہے آہ و شیون
مچا ہر سمت واویلا ہے کیسا ؟
یہ دردِ نارسا فریاد بن کر
کیا کرتا ہے خود توہین اپنی
قدم جب ڈگمگا جاتے ہیں اپنے
کہاں دیتا ہے ساقی بھی سہارا
اگر زخموں میں جاں ہو جانِ منزل
لہو بھر دو نشاناتِ فغاں میں
بنا دو تابناک اس رہگزر کو
ملاتی ہے ازل کو جو ابد سے
جو واقف ہی ہمارے خال و خد سے

ہیں اس جا کیسے کیسے لوگ بستے
وفا کے نام پر دیتے ہیں دھوکے
کہاں کی دوستی، کیسی محبت ؟
دیارِ غیر میں ہم سب ہیں رہتے

مگر اب بھی جو پابندِ وفا ہے
اسے عہدِ جنوں راس آگیا ہے
محبت کا فسوں راس آگیا ہے

ابھی یہ دورِ سرمایہ ہی لعنت
یہ شیطانوں کا سنگِ آستاں ہے
یہ جنگِ زرگری کا پاسباں ہے
اسی لعنت سے پانا ہے رہائی
مٹانا ہے ہمیں اس کی خدائی
نئے انساں، نیا غم پالتے ہیں
نئے آذر نیا بت ڈھالتے ہیں

کہاں ٹوٹے گی یہ زنجیر جا کر
کہاں پر اہرمن کی موت ہوگی
پکارو امن کی دیوی کہاں ہے
یہ جنگِ زرگری کب ختم ہوگی

دھواں اٹھتا ہے اب کون و مکاں سے
چلا آتا ہے اک طوفان بڑھتا
تپش لے کر جہانِ مفلساں سے

نئی گرمی ہے اب آہ و فغاں میں
نیا وجدان ہے سوزِ نہاں میں
نئے ہیں زندگی کے حوصلے اب!
دلوں میں جذبۂ غم آگ بن کر
نئی دنیا بسانے جا رہا ہے
نیا عالم بنانے جا رہا ہے!
وہی فردوس، جس کی آرزو ہے

علی گڑھ ۱۹۵۱ء

ایک شام

یہ شام، مریم و سیتا کی طرح پاکیزہ
اتر رہی ہے سکوں بن کے میرے سینے میں
فضا میں اڑتے ہوئے نرم آنچلوں کا گداز
ہوا میں زلفِ پریشاں کی سرسراہٹ ہے
شفق کے ہونٹ ہیں، جیسے گلاب کے دل میں
کسی حسین تبسّم کا عکس پڑتا ہو
میں سوچتا ہوں، مری روح کی پکار ہے یہ
کہ ایک طائرِ آزاد بن کے اڑ جاؤں
اور آسمان کی پہنائیوں میں کھو جاؤں

علی گڑھ..... ۵۰ء

سالِ نو

اب رات ڈھل رہی ہے، کوئی دو کا وقت ہے
آنکھوں میں نیند جھول رہی ہے ابھی تلک
لیکن میں سالِ نو کے لئے جاگتا رہوں
امید کے چراغ جلاؤں نئے نئے

بیٹھا ہوں خامشی کی نواؤں کو چھیڑ کر
اپنے غموں سے آج بھی فرصت نہیں مجھے
پلکوں پہ آج بھی تو لرزتے ہیں یہ دیئے
لیکن انھیں غموں سے نیا آستاں بنا
وجہِ سکوں ہے آج خیال گریز پا
ٹوٹے ہوئے دلوں کو سہارا ابھی دے سکا

جب دل کی دھڑکنوں سے ملے درسِ آگہی
پھر کس لئے جنوں میں کوئی انتشار ہو
ناکامیاں حیات کی شرما نہ جائیں گی
اس دیس کی فضاؤں سے گر ہم کو پیار ہو

ان میکدوں سے کل بھی نہ تھا مجھ کو واسطہ
جن میں لہو کے جام اٹھاتے ہیں حکمراں
احساس کی نگاہ مگر دیکھتی ہے اب
کچھ اور تیز گام ہوا کاروان شوق
اور سال نو بھی ساتھ اسی کارواں کے ہے

ان جھونپڑوں میں آج چراغاں نہیں تو کیا
دو چار سال اور بھی امکاں نہیں تو کیا
فصل بہار آئیگی جھومیں گی ڈالیاں
پھولوں میں پات پات میں رنگت سمائے گی
ہوں گے کبھی تو جام بکف خاص و عام سب
ہر ہر نگاہ ساغر و مینا اٹھائیگی
زلف حیات شوق سے پرچم اڑائے گی
میں آج سال نو کے لئے جاگتا رہوں
امید کے چراغ جلاؤں نئے نئے

علی گڈھ - ۳۱ دسمبر ۱۹۵۰ء کی شب

شرابی

یہ میکدہ ہے ترا اور میں شرابی ہوں
سنبھال ساقیا، میناکو اپنے ہاتھوں میں
مجھے بھی آج مئے ارغواں کی حاجت ہے

سرک رہے ہیں رخِ کائنات سے پردے
دل و دماغ میں اک روشنی سی در آئی
ہر ایک گھونٹ پہ کچھ زندگی کے راز کھلے
محیط ہوگئی کون و مکاں کی گہرائی

مگر یہ جام کے اندر بھی کیسی تاریکی
بہت ہی تلخ ہے اپنا خمارِ بادہ کشی
کہیں چراغ بجھا، جل اٹھے کہیں فانوس
وہی تضاد، وہی ہے کشاکشِ ہستی
حیات آج کہاں کھینچ کر مجھے لائی

سنبھال ساقیا، میناکو اپنے ہاتھوں میں
حیات کے لئے کوئی شراب ہے کہ نہیں

بس ایک بار تو ایسی پلا دے اے ساقی!
کہ ہوش آ نہ سکے تیرے پینے والے کو

علی گڑھ .... سنہ ۵۱ء

سامراج

یہ حسیں جسم، یہ انگڑائی، یہ نظروں کا فسوں
جانے کیوں خود ہی مگر میری طرف مائل ہے
لاکھ معصوم سہی، سادہ و پرکار سہی
اس نظر کو بھی کوئی کہہ نہ دے ہرجائی پن
دل میں در آنے کی کوشش کے سوا کچھ بھی نہیں

آج تو حشر در آغوش بھی ہو جانے دو
اپنی باہیں مری گردن میں حمائل کردو
بوالہوس بن کے چلو دونوں جہاں ایک کریں

چاک کردوں یہ قبا تن کو برہنہ کردوں
کوئی پردہ نہ رہے اپنی نگاہوں کے سوا

لیکن اب چونک کے دیکھے نہ کوئی عریانی
کوڑھ کے داغ نظر آئے جو پوشیدہ تھے
ایک لمحے میں مری مستی و رندی نہ رہی
اہرمن بھیس بدل کر میرے پاس آیا تھا

علی گڈھ ۔۔۔ ۵۱ء

آدرش

لیلیٔ شوق کی زلفوں سے الجھ کر میں نے
دیکھی حسن کے آئینے میں تصویر جنوں

کروٹیں لیتا ہے اس طرح یہ احساس جمال
جیسے گرتی ہوئی دیوار پہ ہو خضر کا ہات
دھیمے دھیمے سے چلی وادیٔ ایمن کی ہوا
غم کے ہاتوں بھی سنور جاتی ہے تاروں بھری رات

کون کہتا ہے کہ دنیا کو بھلا بیٹھا ہوں
ٹوٹ سکتا ہے بھلا یوں بھی کسی کا پندار
موت ہو جائیگی پامال انھیں راہوں میں
لغزش پا میں سمٹ آیا ہے وحشی کردار

جب کبھی گیسوئے مشکیں سے اٹھی کالی گھٹا
پہلوئے شوق سے ابھرا ہے جنوں کا طوفاں
شعلۂ برق و شرر پھول بنا کس کے لئے
بیچ آیا ہے کوئی اس کی گلی میں ایماں

خواب سا دیکھ رہا ہوں مگر اس محفل سے
توڑ کر جام و سبو آج چلا آیا ہوں
مئے گل رنگ سے چھلکاؤں گا ہر ساغر کو
اپنے ہمراہ دو عالم کا نشہ لایا ہوں

علی گڑھ   سنہ ۵۱ء

علی گڑھ یونیورسٹی

مرکزِ علم و ہنر میکدۂ سوز و ساز
سجدۂ شوق سے آباد ہے رندوں کا حرم
جام در جام ہے صہبائے جنونِ حکمت
دیکھنا ہو تو کوئی دیکھ لے ساقی کا کرم
میگساری کا یہ انداز نہ دیکھا ہم نے
سب کے دکھ درد کا احساس نشے کا عالم

ایک ہی آگ سی ہر روح جلا پاتی ہے
ہو گئے ایک ہی شعلے میں شرارے مدغم
اپنے ہر دور کی تحریک کا آئینہ لئے
پھر اٹھاتا ہے علی گڈھ نئی دنیا میں قدم

راہ دشوار میں اک قافلہ نکہت و نور
سنگ خارا کی چٹانوں کے مقابل ہے کھڑا
ٹوٹ جائے گا بہت جلد طلسم امروز
نور فردا کے تبسم میں بدل جائے گا

فتحپور تال رتوے (اعظم گڈھ) سنہ ۵۱ء

روشنی کا چراغ

کتنے پروانے جان دینے کو — گر رہے ہیں خموش شمعوں پر
سرد راتوں میں ضبطِ گریہ سے — اشک آ گئے ہیں پلکوں پر

اجڑا اجڑا سا یہ مرا کمرہ — کوئی کرسی نہ کوئی میز یہاں
کاپیاں، پرچے اور کتابیں سب — ان کو دیمک سے میں بچاؤں کہاں

ایک سال اور رہ گیا ہے اب — ختم ہو جائے گی مری تعلیم
خاک جب دربدر کی چھانوں گا — کر سکوں گا نہ زیست کی تعظیم

بھائی بہنوں کو خرچ دینا ہے — ان سے وعدہ بھی کر نہیں سکتا
آدمیت کا پاس ہے ورنہ — زہر کھا کر میں آج سو رہتا

آج پھر دق نے میری باجی کو — جا کے پردیس میں دبوچ لیا
کل جو پنڈی سے اس کا خط آیا — میرا سینہ کسی نے نوچ لیا

بٹ گیا ملک، ہو گئے تقسیم — ہم نفس اور محبتوں کے امیں
کیا اسی فصلِ گل کا سودا تھا — خاک اور خوں اگل رہی ہے زمیں

ایک دل تھا، جو بات ہی کوئی
لے اڑا اک نگاہ کے بدلے
واہ وا ہو گئی جہاں بھر میں
کیسا ملا مجھ کو آہ کے بدلے

دکھ کے احساس کے تلے دب کے
ٹوٹ جائے نہ آج میری لے
کیوں نہ ہر غم کو راز داں کر لوں
میرا فن ہی تو میری دنیا ہے

فن سے گویا پناہ ملتی ہے
ورنہ غم کا ابھی علاج کہاں
جس سے دل باغ باغ ہو جائے
اس محبت کا ہے رواج کہاں

کتنی ویران رات ہے لیکن
پھیلتی جا رہی ہے بوئے وفا
پھر کوئی سوچتا ہے ظلمت میں
روشنی کا چراغ گل نہ ہوا

علی گڑھ ۱۹۵۱ء

قید حیات و بند غم

میں ہوں میرا سکوت پیہم ہے
اجنبی دن ہیں اجنبی راتیں
جن سے کوئی چراغ جل نہ سکا
یاد آتی ہیں مجھ کو وہ باتیں
لٹ گیا سارا کارواں اپنا
رہزنوں نے لگائی تھیں گھاتیں

منجمد ہو گئے خموشی میں
عشق اور آگہی کے افسانے
آگ سے اب دھواں نہیں اٹھتا
جل چکے ہیں تمام پروانے
ولولے سرد ہو گئے اپنے
مے سے خالی پڑے ہیں پیمانے

ایک نشتر سیاہ، زہر آلود
سانپ کی طرح پھن اٹھائے ہوئے
دوڑتا پھر رہا نگاہ دوراں میں

وہی نشتر ہے اب رگِ جاں میں
کھنچ گیا درد ایک مرکز پر
شور سنتا ہوں سوزِ پنہاں میں
سوچ کر تھک گیا ہوں بتلاؤ
موت کا حکم سن کے ملزم نے
قہقہے کیوں لگائے زنداں میں

جو اسیرِ ہوس ہوا نہ کبھی
زندگی کا اسیر ہے وہ بھی
میرا گھر لٹ گیا تو اس سے کیا
زندگی اور بھی حسیں ہوگی
ارتقا کی گداز باہوں میں
بھینچ لیتی ہے مجھ کو تاریکی

کون تاریکیوں سے بچتا ہے
کس کو اتنا فراغ حاصل ہے
جان جاتی ہے موت سے پہلے
موت بھی زندگی میں شامل ہے
میرے مایوس سرد لمحوں میں
ایک شعلہ سا چونک اٹھتا ہے

میری آنکھوں میں سیل اشک سہی
اپنے جوبن کے ساتھ بہتا ہے
اجنبی دن ہیں اجنبی راتیں
لیکن اس غم کا ساتھ رہتا ہے
غم جو میری حیات کا غم ہے
غم، جو کل کائنات کا غم ہے

علی گڑھ...... سنہ ۵۱ء

حُسن کی آغوش میں

نگار میں زندگی سے کیوں دور آپڑا ہوں
حیات کے ولولوں کا مدفن ہے زندگی خود

تمہاری پلکوں کی اوٹ میں جھلملاتے آنسو ہیں کس کی خاطر
یہ چشم آہو اداس کیوں ہے
مرے قریب آ کے آج صدیوں کا خواب دیکھو
قریب آؤ، تمہارے ہونٹوں کو چوم لوں میں
خوشی کے لمحوں کو آؤ ہم جاوداں بنا لیں
ہوس کو آؤ خلوص کا آستاں بنا لیں
زمانہ ناسازگار بھی ہو تو کیا کرے گا
اٹھو کہ اب عشق مسکرائے
وفا کوئی راز رہ نہ جائے

یہ ایک لمحہ، تمہارے دم سے، تمام فردا، تمام ماضی
حیات کی طرح اب یہ لمحہ بھی بیکراں ہے
مجھے ہے اب اعتبار نغمہ
یہیں چھپے تھے ازل کے نغمے

ابد تلک جن کا آسرا ہے

ہزاروں غم زندگی میں ہیں، کیا علاج ان کا

تڑپ تڑپ کر جیوں گا، لیکن

یہ ایک لمحہ جو یاد آئے گا، یاد میں مسکراؤں گا میں

نگار! لمحوں میں بھید سارے چھپے ہوئے ہیں

حیات لمحوں کے سلسلے سرنگوں ہوئی ہے

وہ ہم سے پہلے بھی زندگی کا عذاب لمحے ہی کاٹتے تھے

یہ زندگی کا عذاب، یہ داغ ہائے عریاں

یہ درد، سارا جہان جس میں تڑپ رہا ہے

یہ درد تو لادوا نہیں ہے

مگر جہاں میں بھٹک رہا ہوں وہ کوئی راہ وفا نہیں ہے

نگار! میں زندگی سے کیوں دور آپڑا ہوں

حیات کے ولولوں کا مدفن ہے زندگی خود

(۲)

نگار! دیر و حرم میں جا کر

کسی کو تسکیں ملی ہو، لیکن

مجھے یہی داستاں ہے پیاری

کہ اک نگار آئے، زندگی کو سنوار جائے

اور عشق کا لازوال جذبہ کسی کو فکر بلند دے دے

نگار! چنگاریوں میں پھر جان آ رہی ہے
وہ فلسفہ نا امیدیوں کا
جو تھا مرے ذہن و دل پہ طاری
تری نگاہِ کرم کے سائے میں مٹ رہا ہے
میں خول سے، اپنی ذات کے اب نکل رہا ہوں
جو لاش اپنی ہے، آج اسی کو کچل رہا ہوں

(۳)

نگار! تو پاس آگئی ہے تو زندگی آج پھر جواں ہے
سکوں میسر ہے آج پھر میری خلوتوں کو
اسی سکوں میں
کسی کی چاہت نے آدمیت کے راگ گائے
یہ کروٹیں لیں
اسی سکوں نے
طلسم توڑے ہیں گمرہی کے
یہ تیرا قرب آج مجھ کو منزل کی سمت لیکر روانہ ہوگا

میں آج اک درمند دل کی پکار سنتا ہوں خامشی میں
تم ہی بتا مجھ کو، کیسے ٹھکراؤں سارے عالم کی آرزو کو
حیات کے سبزہ زار میں کوئی پھول بھی آج خوش نہیں ہے
نگاہ، وارفتۂ جہاں ہے

خیال بھی آج بیکراں ہے
مرا وہ محروم دل کہاں ہے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ آج کون و مکاں میں گم ہوں

نگار! جو کچھ بھی کر سکوں گا، میں آج تیرے لئے کروں گا
قریب آکر گلے سے لگ جا
تو ہی مری زندگی ہے سرچشمۂ مسرت
ترے ہی دم سے یہ گرمیٔ عشق، میری رگ رگ میں آگئی ہے
لہو کو گرما دیا ہے تیری حلاوتوں نے
کہ اک نگاہِ جمیل میں وسعتیں ہیں دونوں جہاں کی پنہاں

میں آج رنگ بہار لے کر چمن کی جانب پلٹ رہا ہوں
وہاں یہ دار و رسن کے سائے میں جان دوں گا
محبتوں کا مگر تمھیں آسماں دوں گا
کسی کو جب یاد آئے گی داستاں ہماری
تو آنسوؤں کی حسین برسات سے دھلے گی زمیں ہماری

نگار! میں بھیڑیوں کو آبادیوں سے باہر نکال دوں گا
یہ بھیڑیئے، بے قرار ماؤں کی گود کرتے رہے ہیں خالی
یہ بھیڑیئے بچ گئے تو بستی ہماری جنت نہ بن سکے گی

خدا سمجھتا ہے ذہن آدم کو اپنی جنت نہ یاد ہوگی
اسی لیے بھیڑیوں کو پیدا کیا ہے اس نے
نگار آؤ حسین تخیل کو آزمائیں
حسین تخیل سے اپنی جنت کو اس زمیں پہ بھی کھینچ لائیں
ہم اپنے فردا کی یاد میں آج ڈوب جائیں
حیات، فردا کا پیار ہم کو بلا رہا ہے
کلی کلی کا نکھار ہم کو بلا رہا ہے
جو اپنے قدموں کے نیچے اک لالہ زار ہوگا
وہ اجنبی سا دیار ہم کو بلا رہا ہے
چراغ فکر و عمل جلائے گا ہر طرف جو
دلوں کا وہ اعتبار ہم کو بلا رہا ہے
چلو نگار! ان بلندیوں کی طرف چلیں گے
جہاں غم روزگار ہم کو بلا رہا ہے

علی گڑھ ۵۱ء

میرا گاؤں

فتحپور تال رتوئے کی ایک شام کا تاثر

وادیٔ نور ہے گہوارۂ شادابی و حسن
یہ مرا گاؤں تو فردوس کا اک منظر ہے
دھان کے کھیت ہیں، اور تال کی پگھلی چاندی
مارچ کی شام چھلکتا ہوا اک ساغر ہے
چیرتا جاتا ہے اک بار خلا کا سینہ
میرے بے باک عزائم کا کوئی مظہر ہے
دور تک باغ میں شیشم کے درختوں کی قطار
ان درختوں پہ شعاعوں کی حسیں چادر ہے
دستِ فطرت نے دیا مانی و بہزاد کو درس
آج ہر شخص کی تخئیل میں اک آذر ہے

کون ہے جو مری تخئیل کا دامن تھامے
چار سو آج لٹاتا ہے تبسم کے گہر

مصنف کا وطن۔ ضلع اعظم گڑھ کا ایک گاؤں

زلفِ محبوب سی ہوتی ہے معطر یہ فضا
رنگ بھرتا ہے کوئی لالہ و گل کے اندر
چمن یاد میں کھونے لگے دل اور دماغ
لوریاں دینے لگا مجھ کو مرا خونِ جگر

اس نے بھیجا ہے علی گڑھ سی محبت کا پیام
کتنا تابندہ و رخشندہ ہے میرا انجام
یہ فسونِ غمِ جاناں یہ شعاعِ امید
ان فضاؤں میں چھلکتا ہی رہی نقرئی جام

دل جو ہے تازہ مصائب کا نشانہ ہر دم
کیا اسی خانۂ برباد کی کوئی کروٹ
آتشِ عشق کو گلزار بنا دیتی ہے!

ایک دل زندہ و بیدار ہوا کرتا ہے
اندر مٹتے ہی دو عالم سی اداسی کے نشاں
کائنات ایک ہی مرکز پہ سمٹ آتی ہے
رقص کرتی ہے یونہی گردشِ افلاک کے ساتھ
نور ہی نور لئے روحِ بشر کی عظمت

لیکن اے دل تری عظمت، تری دیوانہ پکار
خواب کی گود میں سونے نہیں دیتی مجھ کو
جانے کیوں آج بھی آوارہ و گمراہ ہوں میں
میری نظروں میں یہ رستے ہوئے ناسور بھی ہیں
کسی سیّاح نے لکھا ہے مرے گاؤں کا حال
یہاں غفلت کے پجاری بھی ہیں رنجور بھی ہیں
تشنہ لب رہتے ہیں ظلمت کی گھنی چھاؤں میں
زندہ رہنے کے نرالے ہیں یہاں دستور بھی ہیں
تلخیٔ زیست تگ و دو سے بچا لیتی ہے
خوشیاں تاریک مکانوں سے بہت دور بھی ہیں
لوگ خاموش طبیعت کے ہوا کرتے ہیں
طنز کی آگ میں خود ہی تو جلا کرتے ہیں
راگ پتھر کی چٹانوں میں نہاں ہیں ان کے
در و دیوار ابھی مرثیہ خواں ہیں ان کے
ان کو ہر حال میں دیکھا ہے مری آنکھوں نے
"عمر گذری ہے اسی دشت کی سیّاحی میں"

لیکن اک بار تو ٹوٹے گی یہ زنجیر گراں
یک بیک شور سا اٹھے گا ہر اک جانب سے
ڈوب ہی جائیگی پھر آخری جھنکار کی لے
اور دیوانوں کا بڑھتا ہوا سیلاب عظیم

کھیت کھلیان کی ہر چیز پہ چھا جائے گا

فصل اس سال بھی ماری گئی جانے کیا ہو
اب تو محتاج کسانوں کا خدا حافظ ہے
دانے دانے کو ترس جائیگی بھو کی مخلوق
سوچتا ہوں کہ یہ بستی مری لٹ جائے گی
ماگھ تو دور ہے برسات نہ کٹ پائے گی
اب تباہی سے انھیں کون بچائے لیکن
ہاتھ میں ظلم کی تلوار لئے پھرتے ہو
یہ گنہگار ہیں، دوزخ ہے انھیں کی خاطر
مولوی بھی ہو، زمیندار کے بیٹے بھی تمہیں
تم پہ ظاہر ہے کہاں گاؤں کی مخلوق کا حال
کوئی رادھا یہاں کرتی نہیں سیتا کا سنگھار
نہ تو زیتون کی آنکھوں میں چمک مریم کی
(نہ ہوس ہی کو ضرورت ہے کسی گھونگھٹ کی)
بھوک کا درد ہے، اس درد کی مجبوری سے
عصمتیں لٹتی ہیں، یا جسم بکا کرتے ہیں
انھیں جسموں کے خریدار ہوئے ہو تم لوگ
شوخ و چنچل ہیں، نگاہوں میں گناہوں کا نشہ
سینکڑوں سال سے مجبور رہے ہیں بے باک
دوزخی تم ہو غریبوں کو جہنم دے کر

شیش محلوں کو پری خانہ بنا رکھا ہے
کیا گھڑی آ ہی گئی آپ کی رسوائی کی
دیکھئے کوئی بدل دے نہ جہاں کی تقدیر

ظلم کی چھاؤں میں آہوں کے دیئے جلتے ہیں
یہ مرا گاؤں تو فردوس کا اک منظر ہے
اور اس منظر شاداب کے اندر جیسے
آج ہر سینے میں پیوست کوئی خنجر ہے
وقت کے دوش پہ اب دکھ کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ مری شام خوش انجام بھی ڈھل جائے گی
ہر طرف چھائی چلی جاتی ہے پھر غم کی گھٹا
شمع کی طرح مری روح پگھل جائے گی

۵۱ء

گناہِ آدمِ خاکی

ہوا ہے چار سو اعلان، سازِ ہستی پر
گناہ آدمِ خاکی کی پڑ چکی مضراب
چلا بہشت بریں سے جو قافلہ آگے
زمیں کی وادیٔ ویراں کو کر گیا شاداب

کھڑے ہوئے وہ فرشتے مثال دیتے ہیں
کسی کے گیسوئے مشکیں کو شاخ سنبل سے
خرام مشتری و زہرہ دیکھ کر اک بار
الجھ گیا دل ہاروت ہیچ کا کل سے
کرے گی لذت عصیاں سے آشنا سب کو
صدا جو اٹھتی ہے دورہ کے چاہ بابل سے

نکل رہا ہے وہ اک چاند چاہ نخشب سے
اندھیری رات منور ہوئی ہے کس ڈھب سے
یہ کون ہے جسے دنیا خدا سمجھتی ہے
سیہ نقاب میں چہرہ چھپائے ہے کب سے

چلی وہ زلف کو لہرائے نیل کی ناگن
ہے جس کے عکس سے دریا کی موج بھی بیتاب
جلال ہے کہ یہ حسن و جمال کا افسوں
کھڑے ہیں ریت میں اہرامِ مصر بھی چپ چاپ

تمام فلسفی و شاعر و سیاست داں
ہوئے ہیں خطۂ یوناں میں ایک بار یکجا
اٹھا ہے برتریٔ حسن کا سوال اگر
تو دیوتاؤں میں چرچا ہوا ہے ہیلن کا

ابھر کے سامنے آئی ہے آج روحِ عجم
جلو میں قیصر و کسریٰ کی آن بان لئے
اٹھائے ہات میں لبریز ساغرِ جمشید
سخن کہ حافظ و خیام کی زبان لئے
نگار خانۂ چیں میرے ذہن میں رقصاں
نقوش مانی و بہزاد آج پرافشاں
چھڑا آب گنگ و جمن پر ہزار خواب ہیں
تصورات مرے جن سے جگمگا اٹھے

یہ کس نے چھیڑ دیا ہے فسانہ ماضی
ہر ایک بزم میں کچھ تار جھنجھنا اٹھے

(۲)

یہی زمیں ہے جسے خونِ دل سے سینچا ہے
ہزاروں سال جنوں آزمانے والوں نے
اسی کی گود میں پلتے رہے وہ اہل نظر
جو علم و حکمت و فن کے دیئے جلاتے رہے
تمام دشت و جبل اور مرغ زاروں میں
یہیں پہ حسن کے ہاتھوں ہوئی ہے پہلے پہل
کسی دلہن کی طرح زندگی کی آرائش
شرارہ بن کے اڑا کی ہے آرزوئے نمود
لہو کی بوند فضاؤں میں رنگ بھرتی رہی
حوادثات میں اک کہکشاں ابھرتی رہی
یہیں اٹھایا تھا انسانیت نے پہلا قدم
قدم، کہ جس میں تھا پنہاں ہزار جوشِ عمل
اڑا کے گرد فضاؤں کو دے گئے اذنِ سفر
لگایا جس نے بہاروں کی آنکھ میں کاجل
اندھیری رات کے سینے کو چیر کر جیسے

ابھر رہا تھا کوئی روشنی کا تاج محل

بہار آئی، خزاں آئی، دن گزرتے رہے
ہر ایک لمحہ مگر یادگار بنتا رہا
حیات کشمکش نو بہ نو کا آئینہ
بشر کے سامنے اک اک حجاب اٹھتا رہا
نگاہ جاتی رہی فکر کی حدوں سے پار
دیار غیر میں اپنا چراغ جلتا رہا
کبھی سکوں نہ ملا عالم تجسس میں
تہوں سے ذہن کی، ہر دم سوال ابھرتا رہا
گھڑی گھڑی سے ہوا احتساب شغل دوام
گھڑی گھڑی یہ ہمارا جہاں سنورتا رہا

علی گڑھ - ۵۲ء

ستارۂ صبح

ستارہ صبح کا چمکا،
جہاں میں عشرتِ فردا کا وہ پیغام لایا ہے
وہ اپنے ساتھ عہدِ نو کی صبح و شام لایا ہے

کوئی بستی اجڑتی تھی تو میں آنسو بہاتا تھا
جہاں کا غم مرے حساس دل کو خوں رلاتا تھا
میں اکثر ناامیدی کے بھنور میں ڈوب جاتا تھا
مگر پھر آج امیدوں نے آئینہ دکھایا ہے
یہ آخر کون آیا ہے
عدم کی تیرگی کو چیر کر پہنائے عالم میں

چمن میں ہر طرف اک شور ہے طارق[1] کی آمد کا

[1] ڈاکٹر مختار الدین آرزو کا بچہ
جس کی پیدائش پر یہ نظم لکھی گئی

وہ آیا تو زمانے بھر کے پھولوں کو ہنسی آئی
وہ آیا تو اسی کے ساتھ گویا زندگی آئی

جہاں ظلمت کے سائے پھیلتے بڑھتے تھے ہر جانب
وہیں سے اٹھ رہی ہیں نور کی اب دمبدم لہریں
امیدوں کا چراغاں ہو رہا ہے ہر طرف گویا
زمیں سے آسماں تک روشنی کا جال پھیلا ہے

ارے باد صبا میرا ابھی اک پیغام لیتی جا
اگر مل جائیں تجھ کو آرزو صاحب تو یہ کہنا
کہ ان کی آنکھ کا تارا نیا انسان ہے کل کا
جہاں میں عشرت فردا کا وہ پیغام لایا ہے
وہ اپنے ساتھ عہد نو کی صبح و شام لایا ہے

علی گڑھ ۱۹۵۲ء

شاعر

(کیٹس کی ایک تصویر دیکھ کر)

نہ جانے کتنے ہی ماضی کے خواب بکھرے ہیں
فسردہ بھیگی ہوئی، سوگوار پلکوں پر

جنوں ہے یا کہ خرد، اس نگاہ کا مفہوم
خلا میں ڈھونڈ رہا ہے کوئی نہ جانے کیا
نگاہیں دیکھ رہی ہیں پرے زمانے سے
ہے کھویا کھویا ہوا رمزِ زندگی گویا

فسانۂ غمِ جاناں ہے، یا غمِ دنیا
مچل رہے ہیں ان آنکھوں میں آرزو کے شرار
ان آنسوؤں میں نمایاں ہیں وقت کی لہریں
سنائی دیتی ہے رہ رہ کے زندگی کی پکار

لبوں کو گر ملی جنبش تو نغمہ پھوٹ پڑا
کبھی نشاط کا جادو، کبھی کوئی غم ہے
خموشیوں میں ہے ایمان و آگہی کی جلا
امید و بیم سے آگے نیا ہی عالم ہے

سحر کا نور ہے اس کی نگاہ میں انجمؔ
زمیں کے حسن کو شاداب کرنے آیا ہے

ترچناپلی ۵۲ء

اردو

زندگی بھیس بدل کر جہاں فن بنتی ہے
میرؔ و غالبؔ کا وہ اندازِ بیاں ہے اردو

کبھی کرتی ہے ستاروں سے بھی آگے منزل
چشمِ اقبالؔ سے گویا نگراں ہے اردو

ساتھ انشاؔ کے کبھی ہنستی ہے دل کھول کے وہ
بہرِ فانیؔ کبھی مصروفِ فغاں ہے اردو

حاصلِ بزم ہے اور بزم کو تڑپاتی ہے
جانِ میخانہ ہے، میخانۂ جاں ہے اردو

گاہ پروانے کی میت پہ کھڑی ملتی ہے
صورتِ شمع جہاں گریہ کناں ہے اردو

گاہ خوشیوں کے چمن زار میں جا بستی ہے
موسمِ گل کی جہاں روحِ رواں ہے اردو

محوِ گلگشت جہاں حورِ بہشتی مل جائے
قابلِ رشک وہ گلزارِ جناں ہے اردو

ہر غزل کوچۂ جاناں سے زیادہ پیاری
ہر نظر شعر ہے، تصویرِ بتاں اردو

ہر نئی نظم نئے موڑ پہ لے جاتی ہے
روحِ امروز ہے، فردا کا نشاں ہے اردو

دھل گئی کوثر و تسنیم کے پانی سے مگر
جنّتِ ارض کی مظلوم زباں ہے اردو

باغباں مجھ کو اجازت ہو تو اک بات کہوں
نغمہ بلبل کا ہے پھولوں کی زباں ہے اردو

ملتے ہیں اس سے ہزاروں ہمیں تہذیب کے درس
اس قدر ذہن پہ کیوں تیرے گراں ہے اردو

اب بھی چھا جاتی ہے ہر روح پہ مستی بن کر
اس خرابی میں بھی افسون جواں ہے اردو

بمبئی ۵۴ء

خوش آمدید

آج اس بزم میں آئے ہو بڑی دھوم کے ساتھ
بیخودی محوِ نظارا ہے تمھاری خاطر

یاد آتے ہیں وہ ایّام جدائی ہم کو
جنھیں ہنس ہنس کے گذارا ہے تمھاری خاطر

گو ہے لطفِ سخن خالی نہیں پندارِ جنوں
یاں غمِ عشق کا یارا ہے تمھاری خاطر

رنج اٹھانا تو کوئی بات نہیں ہے لیکن
زہر پینا بھی گوارا ہے تمھاری خاطر

ہار اور جیت کے مفہوم میں کیا رکھا ہے
جیت کر بھی کوئی ہارا ہے تمھاری خاطر

ترکِ شیراز ہو تم، حافظِ شیراز ہوں میں
اب سمرقند و بخارا ہے تمھاری خاطر

تم جو آئے ہو تو اس زیست کی لذّت پاکر
ہم نے عالم کو سنوارا ہے تمھاری خاطر

آج ہم نے مہر و انجم کو بھی زحمت دی ہے
آسمانوں سے اتارا ہے تمہاری خاطر
لالہ و گل کو، بہاروں کو، سمن زاروں کو
دیدۂ و دل نے پکارا ہے تمہاری خاطر
پھر یہاں شیشہ و ساغر سے چراغاں ہوگا
پھر کوئی انجمن آرا ہے تمہاری خاطر

کراچی ۵۶ء

دریچے کی چاندنی

چاندنی چھن چھن کے آتی ہے دریچے سے ابھی

نور میں ڈھل کر چلی آئی حسینہ رات کی
یوں برہنہ سامنے آنکھوں کو شرماتی نہیں
دیکھتا ہوں اپنے بستر پہ ابھی لیٹا ہوا
حسن عالم تاب اس کا اور نیند آتی نہیں

رقص کرتی آ رہی ہیں یوں نظر کے سامنے
خامشی میں یہ خیالوں کی حسیں پرچھائیاں
جیسے اک بے نام خواہش کے ہزاروں روپ ہیں
یا مرے دل میں خوشی کی لہر کی انگڑائیاں

میری تنہائی میں کوئی درد، کوئی غم نہیں
آج کچھ ایسا ہے، میری آنکھ بھی پرنم نہیں
مل رہا ہے مجھ کو اس عالم میں بے پایاں سرور
ایک ٹھنڈک سی ہے دل شعلہ نہیں شبنم نہیں

چاندنی کی ہمرکابی میں ہوا کے دوش پر
مستیاں اڑ کر یہاں آئی ہیں کتنی دور سے
رات کا پچھلا پہر ہو جیسے اور مانگے شراب
میکدے میں رند غافل ساقیٔ مخمور سے

میرے کمرے میں اجالے کا یہ اک آنگن سا ہے
ناامیدی کے بھنور میں آس کا دامن سا ہے
دیکھتا ہوں اس اجالے میں حسیں خوابوں کا عکس
اس کے ابرو، یا کسی مسجد کی محرابوں کا عکس

ساتویں شب کا ادھورا چاند یہ پھاگن کی رات
کوئی آجائے تو رہ جائے کسی کے دل کی بات
جاوداں ہے رمزِ ہستی، جاوداں میرا جنوں
آ کے کوئی بخش دے ہر ایک لمحے کو ثبات
چاندنی چھن چھن کے آتی ہے دریچے سے ابھی

کراچی ۵۶ء

عروسِ فردا

جس سے آباد ہے یہ بزمِ شبستانِ خیال
وہی صورت نہیں گلفام عروسِ فردا
غمِ امروز کا انعام عروسِ فردا

ماضی و حال کی زنجیر کے بجنے کی صدا
اس کے ہونٹوں کا سبک گام ترنم گویا

ہے ازل ہی سے یوں ہی قافلۂ زیست رواں
کبھی راہوں میں بگولے کبھی منزل پہ دھواں
ڈال کر گردشِ دوراں کے گلے میں اک ہات
اجنبی راہ پہ ہوتی ہے تگ و تازِ حیات
راہ جاتی ہے اسی منزلِ فردا کی طرف
رہ روانوں کے جہاں خواب پڑے سوتے ہیں

رات دن دہر میں چلتی ہے ابھی بادِ سموم

دل میں رہتا ہے مگر تازہ امنگوں کا ہجوم
زندگی کیا ہے، عزائم کے سوا کچھ بھی نہیں
حوصلہ ہو تو یہ آلام و بلا کچھ بھی نہیں
زخم بھر سکتے ہیں گر وقت کا مرہم رکھئے
لالہ و گل کے کٹوروں میں یہ شبنم رکھئے

دل یہ کہتا ہے کہ اب رنگ خلاؤں میں بھرو
منزلِ شوق سے پہلے کہیں آرام نہ لو
توڑ دو بڑھ کے بس اک بار طلسمِ امروز
ہے نئی دید کا مشتاق جہانِ پرسوز
اٹھ کے چھلکا دو شب و روز کے پیمانوں کو
اک نیا جذبۂ بیتاب دو دیوانوں کو

خوابِ فردا سے نجمِ راہ گزر ملتا ہے
عزمِ بیدار سے اک اذنِ سفر ملتا ہے
اک قدم اور کہ یہ عزمِ جہاں گیر بنے
خواب کہتے ہو جسے، خواب کی تعبیر بنے

(کراچی ۔ سنہ ۵۶ء)

سرو

باغ میں کیسا یہ چپ چاپ رہا کرتا ہے
پیش کرتا ہے مگر گلبدنی کا منظر

صورتِ جلوۂ جانانہ بصد ناز و ادا
دل لبھاتا ہے ابھی لغزشِ پا سے بچ کر

حسنِ محبوب کا عکس کدھر سے آیا
کیوں ٹھہرتی نہیں اس کے قدِ بالا پہ نظر

جانِ جاں کہئیے، اسے جانِ تمنّا کہئیے
ہے وہی رنگِ تماشا، وہی رنگیں پیکر

بات کہنی ہے جو اُس شوخ سے کہدوں اس سے
راز جو دل میں ہے وہ اس سے چھپاؤں کیونکر

(راولپنڈی ۱۹۵۷ء)

چلی نہ بادِ بہاری

چلی نہ بادِ بہاری، نہ ابر ہی برسا
اِس امتدادِ زمانہ سے ہو گئی ویراں
گیاہِ خشک کے مانند زندگی ساری

کہاں گئے وہ محبت کے رازدار تمام
جو خوابِ زہرہ و ناہید لے کے آئے تھے
وفا کی حسن سے امید لے کے آئے تھے
جو بن سکے نہ زمانے کے حافظ و خیام

بھٹک کے راہ سے یہ قافلہ کہاں پہنچا
نہ لطفِ میکدہ باقی، نہ زندگی کا بھرم
نہ دل میں آتشِ سوزاں، نہ آرزوئے صنم
جمالِ یار نظر تک دھواں دھواں پہنچا

اُگل رہی تھی ابھی اشرفی کے ڈھیر زمیں

نجانے کیسے اچانک یہ کاروبار رُکا
رُکا زمانہ، مہ و سال کا شمار رُکا
کسی کو آج بہاروں کا انتظار نہیں

نہ حوصلہ، نہ کوئی آرزو، نہ کوئی امنگ
جو اس دیار میں آیا وہ زیست کو ترسا
چلی نہ بادِ بہاری نہ ابر ہی برسا

(کراچی ۱۹۵۹ء)

تیرگی

کتنی تاریک ہے شب
ہر طرف کالی بلاؤں کا ہجوم
اہرمن جاگ رہا ہے کب سے
دوڑتے پھرتے ہیں تاریکی میں
رات کے کتنے بھیانک سائے
دل لرز اٹھتا ہے رہ رہ کے مرا
اس اندھیرے میں جو آتی ہے صدا
ہات سے ہات کے ٹکرانے کی

رات تاریک ہے اور تو بھی مرے پاس نہیں
تیرے آنے کی کوئی آس نہیں
وحشتِ تنہائی ہے افلاک کی پہنائی ہے
میرے آوارہ خیالوں کی گھٹا چھائی ہے

زندگی جام سے ٹکراتی ہے میخانوں میں
چھپ کے بیٹھی ہے مگر آج نہاں خانوں میں

رنگ بھرتی نہیں افسانوں میں
چاند کی سمت ہی پرواز جنوں والوں کی
بات ہی اور ہے دیوانوں کی
ایک ہی جست میں افلاک پہ جا پہنچے ہیں

میں کہاں ہوں، کہ اندھیرے کے سوا
اور یہاں کچھ بھی نہیں
دُور ہے قافلۂ صبح بہار
آگہی راہ میں ملتے ہوئے کتراتی ہے
رات تاریک ہے، اور تو بھی مرے پاس نہیں
تیرے آنے کی کوئی آس نہیں

اس اندھیرے میں مگر خونِ جگر کی شمعیں
اپنے ویرانے میں روشن کر لوں
مجھ کو تا صبح اسی طور پہ جلنا ہوگا

جامِ خورشید اُٹھانے کے لئے
نورِ خورشید کو پلکوں میں چھپانے کے لئے

(کراچی ۱۹۵۹ء)

کتنے فریب ٹوٹتے جائیں گے راہ میں
کتنا نکھار زیست کے ہونٹوں پہ آچکا

ستونِ کہنہ

ابھی اس بزم کی رونق
جوانانِ وطن کی بے قراری ہے
مسلسل آہ و زاری ہے
تمناؤں کی خوں گشتہ بہاروں پر
شکستہ خواب کے سائے لرزتے ہیں
محبت نیم جاں ہے
آدمیت کا حرم ویراں
نجانے کتنے ہی بیٹھے ہیں گھبرائے
کفن پہنائے اپنی آرزوؤں کو

کدھر ہے وہ نئی دنیا
فسانوں کے نئے عنواں
طلب میں جن کی دیوانے نکل آئے
جنوں کی مشعلیں لے کر
وفا کی شاہراہوں پر

درِ زنداں سے گزرے اور کبھی ہنس کر
فرازِ دار تک پہنچے

پسِ پردہ

یہ کس کی چال ہے، کون آزماتا ہے
شہیدوں کا لہو جب بھی
ابھرتا ہے افق پر روشنی بن کر
کوئی ظلمت کا جادو اور شدت سے جگاتا ہے

سنا ہے رات کے وحشی درندوں نے
سحر ہونے کے امکاں کو مٹایا ہے
پئے تدبیر زنجیر ستم میں کچھ نئی کڑیاں بڑھا دی ہیں
مزاجِ جبر پر پابندیاں جتنی تھیں وہ ساری اٹھا دی ہیں
اب اس کے بعد کیا باقی رہا ہے ان کے ترکش میں
اٹھو اے ساتھیو! تعمیرِ نو کا وقت آ پہنچا
ہماری ضرب اِس کہنہ ستوں پر آخری ہوگی

(کراچی ۱۹۵۸ء)

گلبانگِ جرس

(۱)

طلسماتِ جہانِ آب و گِل میں تم بھی آئے ہو
اِسی کا ایک حصّہ ہو
جگالو اپنے افسوں کو
وطن کے اِن پہاڑوں اور دریاؤں کے سینے میں
تمہاری دلبری کے رمز پنہاں ہیں
ذرا اِس میکدے کی خاک بھی چھانو
تمہارے نام کی مے جس جگہ ساغر میں ڈھلتی ہے
پڑے سوتے رہے ہو خواب کے رنگیں محلّوں میں
نِکل کر اِن سے دیکھو، زندگی کِس سمت جولاں ہے
نویدِ زندگی پہلا قدم ہے، خواب سے آگے
محبت کی طرح معصوم اور تخلیق کا پیکر
بشارت موسمِ گُل کی، اور آئینہ بصیرت کا
اِسی نے رہبری کی ہے عمل کی شاہراہوں میں
ابھی راہوں میں کتنے نقش بالکل ہی ادھورے ہیں

جنھیں خونِ جگر شاداب اور رنگیں بناتا ہے
شہیدانِ محبّت کا لہو جب رنگ بھرتا ہے
تو یہ عالم نکھرتا ہے۔
غرض تعمیر سے ہے، انجمن کے حُسنِ کامل سے
نشاطِ زندگی کے سائے اس کے ساتھ رقصاں ہیں
ہم اِس کے واسطے اپنی تمناؤں کی دنیا میں
جنوں کے کتنے ہی اندازِ بیباکانہ لائے ہیں
جو تم چاہو تو اپنی دلبری کو رہنما کر کے
ہمارے کارواں سے آکے مل جاؤ
محبّت ہو کہ جرأت، سب اسی کے کام آتے ہیں
وفا کی اک کہانی ہے جو ہم دُہرائے جاتے ہیں

(۲)

وطن ہو، یا جہاں ہو، یا کوئی آفاق کا منظر
نظر جس سمت بھی اُٹھی، نئے امکاں اُبھر آئے
غمِ امروز سے فردا کی راہیں کھُلتی جاتی ہیں
تراشے جذبۂ تخلیق نے کتنے نئے پیکر
اُبھرتا آرہا ہے آگہی کا اِک نیا سورج
کمندیں ڈالتے جاؤ ستاروں پہ

کھلا ہے بامِ گردوں، اور پرِ پرواز ہیں راکٹ
خلا میں ہے جنوں کی کار فرمائی
نئے عالم کی رسوائی
رہِ سیّارگاں پر ہو رہا ہے رقصِ مستانہ
نیا ہے دَورِ پیمانہ
چھلک اُٹھتے تھے ساغر اب چھلکتا ہے یہ میخانہ
زمیں سے چاند سورج تک
حیاتِ نَو بہ نَو کی ہو گئی اِک رہگزر پیدا
وہ ہے دیوانگانِ عشق کی اک آرزو جس سے
صداقت نے کئے ہیں بال و پر پیدا
جو ہوں گے صاحبِ اِدراک کر لیں گے
تبسّم ہائے پنہاں سے نظر پیدا
اندھیرا چھٹ رہا ہے رات کا جادو
سمٹتا ہے، کہ ہوتی ہے سحر پیدا

(۲۳)

سحر دم، قافلے والوں کی جاگا جاگ ہے کیسی
نوائے سرمدی بن کر جو گلبانگِ جرس اُبھری
ہوئی ہے کوچ کی، ہنس ہنس کے تیاری

یہ چلے ہیں رہروانِ مست و بے پروا
خود اپنے شوق میں ڈوبے
کہاں ہے منزلِ جاناں کدھر سے راہ نکلی ہے
قدم پڑتے ہیں تاہید و ثریّا پر
یہ ان کے برق پا رہوار، ان کا دل بڑھاتے ہیں
خلا میں رنگ اُڑاتے ہیں
کچھ اِس انداز سے ارض و سما کے گیت گاتے ہیں
فرشتے بارگاہِ قدس میں جیسے
مؤدّب
صف بہ صف
اقرار کرتے ہوں، خدائی کا
خدا کو حمد کا نغمہ سناتے ہوں
عبادت کے حسیں لمحوں میں اپنے ڈوب جاتے ہوں

اُجالا ہو رہا ہے پھر اب کیا ہے
نقابِ شب اُلٹ دو، چہرۂ عالمتاب کے رُخ سے
زمیں کا ذرّہ ذرّہ خواب سے بیدار ہوتا ہے
جو کل تک مُردہ و بے جان تھے، اُن میں بھی جنبش ہے

اُٹھو، اے لیلئ گیتی کے دیوانو!
سُناؤ عظمتِ آدم کے افسانے
پرستش سعئ پیہم کی کرو، دیر و حرم چھوڑو
نشاطِ آگہی میں ڈوبتے جاؤ
بنی ہے مرکزِ کون و مکاں دُنیا
اسے آغوش میں لے کر
اُٹھو اور عرصۂ آفاق میں اِک رقص فرماؤ
تمہارے برق پا رہوار، گو رُکتے نہیں لیکن
اگر تھک جاؤ تو دم بھر ٹھہر جاؤ
مہ و انجم کی ٹھنڈی چھاؤں میں جا کر اُتر جاؤ

سفر جاری رہے گا، کہکشاں، در کہکشاں یوں ہی
جَرَس بجتا رہے گا کارواں در کارواں یوں ہی
گلے ملتے رہیں گے اب مکان و لامکاں یوں ہی

(کراچی ۱۹۵۹ء)

فرازِ عرش سے آگے

مکان و لامکاں کی بات کرتے ہیں یہ دیوانے
ہماری سرزمیں کے، یا کہاں کے ہیں یہ افسانے
بھلا مرّیخ پر جانے کا یہ عزمِ جواں کیا ہے
مجھے بھی کچھ بتاؤ، ان کا اندازِ بیاں کیا ہے
سرورِ نور میں ڈوبی ہوئی تقدیر کیا شے ہے
کوئی کہتا ہے، اب کونین کا ہر فاصلہ طے ہے
کوئی فکرِ جواں کا نام لے لے کے اُچھلتا ہے
مہ و انجم اگر لا دو، تو اس کا جی بہلتا ہے
نشاطِ کامرانی کا ہے جذبہ کس کے سینے میں
ہوئی ہے وسعتِ آفاق گم دل کے نگینے میں

دلِ کونین، چلئے گیسوئے گیتی سے اُلجھائے
فرازِ عرش سے آگے مکاں اِک اور بن جائے

(کراچی ۵۹ء)

کراچی

اِک ہجومِ بیکراں
شہر کی سڑکوں پہ، گلیوں میں رواں
دن کے ہنگاموں کو رکھتا ہے جواں

ایک جانب سلسلہ ہائے عماراتِ بلند
جن کے مینارے فلک سے مل گئے ہیں جابجا
شہر کی سطوت کے، عظمت کے نشاں

دوسری جانب ہے بوسیدہ مکانوں کی قطار
مدتوں سے گردشِ لیل و نہار
ہے اس آبادی میں جن کی نوحہ خواں

اے کراچی! اے نگارِ جانستاں!
گو ترے رُخ پر کھلی ہے چاندنی
تیری گلیوں میں اندھیری رات ہے

(کراچی سنہ ۶۰ء)

بحرِ عرب کی ہوا

ساحلِ بحرِ عرب کی یہ ہوا
سر کو ٹکراتی در و دیوار سے
شہر کی گلیوں میں آوارہ پھری

اس کے دل میں کوئی اندیشہ ہے کیا
یا غمِ امروز سے بیتاب ہے
سر سے پا تک پارۂ سیماب ہے

آج سے پہلے کبھی اپنے دوش پر
دُور دیسوں کے سفینے لائی تھی
گہرے رازوں کے دفینے لائی تھی

دل یہ کہتا ہے کہ ملّاحوں سے آج
کوئی قصہ اور سُن کر آ گئی
سر کو ٹکراتی در و دیوار سے
شہر کی گلیوں میں آوارہ پھری

(کراچی سنہ ۶۶ء)

بندرگاہ

سامنے ساحل کے ہے اک تنگنائے
جس میں واقع ایک بندرگاہ ہے
جو کلیدِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

شہر کی ہے تاجرانہ زندگی
لوگ بک جاتے ہیں سستے دام پر
مال،
گوداموں میں بند
دل کے زخموں کی طرح عریاں نہیں
ہاں یہ بندرگاہ اب بھی ہے کھلا
دیکھنا یہ ہے ابھی اس راہ سے
کتنے تاجر ادھر آتے ہیں اِدھر

اے وطن کے پاسبانو! اٹھ بھی جاؤ
ناخدا ہیں جن کے سوتے، جن کے لنگر ہیں گرے

ان جہازوں کا کوئی بیڑا بناؤ
بحر کی موجوں سے جو اُلجھا کرے

(کراچی سنہ ۶۰ء)

جل گیا اپنا نشیمن، تو دھواں دیکھ سکے
بے خودی! تجھ کو تو ہم یاد کیا کرتے ہیں

رقصِ شبانہ

جا کے میخانے کے رندوں سے کہو
جام چھلکائیں
صبوحی کی ادا دکھلائیں
انجمن خواب میں مدہوش سہی
برف کی سِل کی طرح سرد نہ ہونے پائے
رنگ اور نور کی لہروں کو جگانے جائیں
زندگی بادہ و مینا ہی میں خوابیدہ ہے
معجزہ، آتشِ سیّال میں پوشیدہ ہے
پینے آئے ہیں تو اس طرح سے پینا ہو گا
کم سے کم وقت کی رفتار کا اندازہ تو ہو
تشنگی ڈوب چلے، شوق کا در باز تو ہو
صبح تک کون جیے، کون مرے
رات کے پچھلے پہر ساز کی لَے تیز کریں
اور اک رقص کریں
آخری رقص، جو عنوانِ سحر بن جائے

(کراچی ۱۹۵۹ء)

دیوداس

زندگی عشق کی، وحشت بھرا افسانہ تھی
میرے ہاتھوں میں وہ اک زہر کا پیمانہ تھی

روح کا غم مئے گلفام سے کم کیا ہوتا
کوئی تریاق بجز وصلِ صنم کیا ہوتا
کھو گئی پاربتی، روتی رہی چندر مکھی
زندگی لُٹتی رہی راہگزاروں میں مری
غمگساروں کی بھی یاد آئی، مگر بھول گیا
اس کی باہوں کے سوا کچھ نہ مجھے یاد رہا
اِک اُبھرتی رہی تصویر، خلا میں برسوں
میں اکیلا ہی پھرا دشتِ وفا میں برسوں
جل بُجھا جسم کے ہمراہ، دلِ سوزاں تک
جان دینے چلا آیا ہوں درِ جاناں تک
مر رہا ہوں، جیسے کوئی بے بس و لاچار مرے
کیا قیامت ہے کہ یوں عشق کا بیمار مرے

ناامُیدی ہے کہ اب طاقتِ دیدار گئی
رُخِ جاناں کی ہوس، روح گرفتار گئی

رات لو ختم ہوئی اور زباں بند ہوئی
مجھ کو معلوم تھا، خاموش سویرا ہوگا
لوگ پھینک آئینگے، مجھ کو جہاں، اس مرگھٹ پر
موت کا چھایا ہوا گھور اندھیرا ہوگا
چیل کوّوں نے مگر لاش کے ٹکڑے کرکے
ہر طرف کوچۂ جاناں میں بکھیرا ہوگا

(کراچی۔ سنہ ۶۰ء)

خوابِ سحر

صبح ہوتی ہے، در و بام سجالے اپنے
ابھی خورشیدِ جہاں تاب نکل آئے گا

پو پھٹی، ٹوٹ گیا شب کے اندھیرے کا طلسم
ہوگیا روئے چمن رنگِ شفق سے گلنار
گریۂ نیم شبی نے نئی صورت پائی ——
وقت کے عارضِ گلگوں پہ ہے شبنم کی بہار
پھیلتی جاتی ہے پیراہنِ گل کی خوشبو
دشت و کہسار پہ ہے نورِ سحر کی یلغار
عندلیبوں سے کہو، نغمہ سنائیں ایسا
وجد میں آکے کریں رقص، عروسانِ بہار
جل بجھے انجم و مہتاب کے شب تاب دیئے
باندھ کر پرتوِ خورشید سے پیمانِ سحر
ہر گلی کوچے میں در آئی نسیمِ سحری
ایک اک فرد سے ہنس کر کہا، اے جانِ سحر!

صبح ہوتی ہے در و بام سجالے اپنے
ابھی خورشیدِ جہاں تاب نکل آئے گا

(کراچی۔ سنہ ۶۰ء)

محبت ہے اک تازیانہ

(۱)

میری ناہید! میرے طرب زار کی ایسی تتلی ہے تُو
رقص کرتی ہے جو ہر طرف میرے دل کی اُمنگوں کے پھولوں کے اندر
رقص سے کھل رہے ہیں نئے پھول بھی آرزو کے
زمانے کی غارتگری سے جو محفوظ ہوں گے
جنہیں وقت اور فاصلے کی متعین حدوں میں
پیام اک ملا جاوداں زندگی کا
تری اِک نظر نے تبسم کو ان کے حیاتِ ابد بخش دی ہے
گُلِ شعر نغمہ کو دیکھو
ترا ہی سحابِ کرم اب اسے زندگی دے رہا ہے
ازل کی حسیں مسکراہٹ نہ جانے کہاں سے اسے مل گئی ہے
میں یہ دیکھتا ہوں
کہ امروز کی تنگ وادی سے آگے
ترا نقشِ پا ہی مجھے اب وہاں لے چلا ہے
جہاں کی زمیں پیار کے آنسوؤں سے دھلی ہے
جہاں کا چمن چاند سورج کے مانند دہکا ہوا ہے

جہاں لالہ و گُل میں خونِ جگر کی طراوت، نئی آرزو کی مہک ہے
بادۂ زندگی کی رمق ہے
ترا نقشِ پا عالمِ خواب سے ماورا لے چلا ہے
وہاں، اس حقیقت کی جانب
جہاں ماضی و حال و فردا اِک ایسی لڑی میں پروئے گئے ہیں
کہ خود کہکشاں اس کی تابندگی سے لجائے
آسمانوں میں چہرہ چھپائے
زمانے کو تیری نظر کا، مرے بازوؤں کا سہارا ملا ہے
آج تخلیق کا ہر طرف در کھلا ہے
شاعری جو غرورِ زمیں ہے
رازِ ہستی کی سچّی امیں ہے
سانس لینے لگی ماہ و انجم سے آگے
آسماں کی طرف کھل گئے شاعری کے دریچے
چل رہی ہیں دریچوں سے ہو کر مقدس ہوائیں
ہواؤں نے کتنا مدھر گیت چھیڑا ہے ہر سو

کہیں پیار کی راگنی ہے
کسی زلف کے پیچ و خم ڈھل گئے راگ کے زیر و بم میں

کہیں آگہی گیت بن کر اُترتی ہے سینوں کے اندر
کہیں کوئی تازہ پیامِ عمل زندگی کو جگانے کی خاطر
کہیں کوئی غم سے بھرا گیت سُونے گھروں کا
کہیں آرزوؤں کے رنگیں محل ہیں درخشاں
کہیں خواب کے چند دھندلے سے مناظر
کہیں روح گاتی ہے مدھم سروں میں
کہیں ساری انسانیت کا ہے کورس
فقط ایک نغمہ، فقط ایک لے تو نہیں ہے
ہزاروں دُھنوں میں حقیقت کی جلوہ گری ہو رہی ہے

میری ناہید! تیرا فسونِ محبّت
گیت بن کر مرے ہونٹ پر آچکا ہے
زمانے کی ہر چیز پہ چھا چکا ہے
پیار تیرا، مرا نغمۂ جاوداں بن چکا ہے

(۲)

میری ناہید! آنے سے تیرے
میرے ماتم کدے میں اجالا ہوا
تیرگی چھٹ گئی اور من کے اندھیرے نگر میں سحر ہو گئی

کتنی برباد تھی زندگی
غم کے ویران ساحل پہ سوئی ہوئی تھی
جتنے طوفان تھے زندگی کے
خامشی اُن پہ چھائی ہوئی تھی
موت کے ہاتھ میری طرف اُٹھ رہے تھے
اور میں تھا کہ غافل پڑا سو رہا تھا
ایک مدت سے بیکار تھی قیمتی آنسوؤں کی وہ مالا
جسے ڈال دیتا تھا میں زندگی کے گلے میں
پجاری تھا میں زندگی کا

اگر تو نہ آتی تو ممکن تھا اس خوابِ غم میں
کبھی موت کے ہاتھ میرا گلا گھونٹ دیتے
مگر تو نے آکر پکارا
مرے آنسوؤں کو نکھارا
مجھے بخش دی زندگی، زندگی کا کنارا
کہاں بحرِ ظلمات کی تیرگی تھی
کہاں مل گیا نور کا یہ سہارا
کوئی مسکرایا تو سارا جہاں مسکرایا

زمیں مسکرائی تو پھر آسماں مسکرایا

(۴۳)

میری ناہید! تو آبرو ہے مرے دیس کی
تیری پاکیزگی اور تیری وفاؤں کے آگے
ہزاروں حسیناؤں کا پیار بھی کچھ نہیں ہے
حسیناؤں میں یہ ترے دل کی جرأت کہاں ہے
زمانے کے رُخ کو بدلنے کی ہمت کہاں ہے
تجھے دیکھتا ہوں تو اے جانِ انجم
مہ جبیں، ہیر اور سوہنی یاد آتی ہیں مجھ کو
لکھنؤ سے بنارس تجھے کون لے جائے گا
تیری آزاد فطرت پہ زنجیر کیسے اُٹھے گی
تو نسوانیت اور محبت کی اقدار کی پاسباں ہے
موت سے کھیل سکتی ہے اپنی "نظر" کی حفاظت کی خاطر
تجھے خوف طوفان کا کچھ نہیں ہے
تُو تو "کچے گھڑے" کے سہارے بھی اس پار جانے کو تیار ہے
تُونے دُہرا دیا ہے فسانہ غمِ عشق کا، جاوداں زندگی کا

میں سمجھتا تھا آدرش اِک وہم ہے اِک گماں ہے

تو نے اس وہم کو بھی حقیقت بنایا
میں نے دیکھا کہ تو میری تخئیل کو چاک کرکے
مجسّم کھڑی تھی مرے سامنے
تو ہی میری نظر کا وہ شہ کار ہے
جستجو میں ہوا جس کی میں در بدر کا بھکاری
چھان آیا ہر اک گاؤں، ہر شہر کی خاک جاکر

کبھی آس نے مشک و عنبر لٹائے، کبھی یاس کی تیرگی میں
گناہوں سے آلودہ ہوتا رہا میرا دامن
اِسی کشمکش میں گزارے کئی سال میں نے
اِسی کشمکش میں مری آس ٹوٹی
نراشا کی آغوش میں بند آنکھیں کئے مدتوں تک پڑا تھا
اچانک کھلی آنکھ تو سامنے تُو کھڑی تھی
عجب وہ گھڑی تھی
میں حیران تھا کون سی زندگی ہے
حقیقت ہے یا خواب کی انجمن ہے
تجھے دیکھ کر دل میں خوشیوں کا گویا چراغاں ہوا
نئی نئی شاہراہیں چمکنے لگیں روشنی میں

میں فرطِ طرب سے اُٹھا، اُٹھ کے تجھ کو گلے سے لگایا
گناہوں کی سب داستانیں تجھے چپکے چپکے سنا دیں
(وفا کی بھی کچھ داستانیں تھیں اس میں)
تو خاموش سنتی رہی اور کچھ بھی نہ بولی
فقط ایک آنسو تری آنکھ میں آگیا تھا
مرا داہنا ہاتھ تو نے اٹھایا
اسے اپنے لب سے لگایا
مرے ہاتھ کو چوم کر مسکرانے لگی تو
تری مسکراہٹ مجھے اک نئی زندگی دے گئی
مرے خشک ہونٹوں کو سچی ہنسی دے گئی

مجھے تو مری جان! مجھ سے گلہ تک نہیں تھا
مجھے پیار کے رتھ پہ تو نے بٹھایا
مری انجمن کو وفاؤں سے تو نے سجایا

(۴)

تجھے کتنا چاہوں، تجھے کیا کہوں جانِ انجم
مری زندگی، میرا ایمان ہے تو
خدا بن کے تو آگئی ہے مری زندگی میں

مرے پاس تیرے کرم کے سوا اور کیا ہے
میں بدنام و رسوا تھا اِک بُت کی خاطر
تجھے میں نے اس بُت کا قصّہ سُنایا
وہ نظمیں سُنائیں جنھیں میں نے رو رو کے اکثر لکھا تھا
وہ تصویر تجھ کو دکھائی
جو اس بُت نے دو سال پہلے مری نذر کی تھی
بارہا بھول کر نام سے میں نے اس بُت کے تجھ کو پکارا
مگر تو نے ہر بار مجھ کو گلے سے لگایا
مرے سر کو ماں کی طرح تھپتھپایا
مجھے ہنس کے یہ بھی بتایا
کہ اس بت سے کس کو محبّت نہ ہوگی
نیک روحیں سبھی ایک ہوتی ہیں انجم!
ترے بت کی میں رازداں ہوں
پیار تیرا جو مشہور ہے ہر طرف
میں بھی اس پیار میں جاوداں ہوں
زمانہ مگر راہ میں ایک سنگِ گراں ہے
اسی نے چھڑایا تھا اس بت سے تجھ کو
ہے دشمن وہی اب ہمارا

چھپایا اسی نے ہے اس جانِ جاں کو
جسے تو نے رو رو کے اکثر پکارا
چلیں اور چل کر زمانہ بدل دیں
محبّت کا سارا فسانہ بدل دیں

(۵)

مری جان تو نے مجھے ایسی قوت عطا کی
کہ دار و رسن پر بھی قدموں کو لغزش نہ ہوگی
مجھے جان کا خوف پہلے ہی کب تھا
مگر اب اکیلا نہیں ہوں، ترا ساتھ بھی ہو گیا ہے
ترے ہاتھ میں ہاتھ دے کر میں یہ سوچتا ہوں
کہ تیری وفا کو زمانے میں مشہور کر دوں
اس عہدِ وفا کو میں خونِ جگر دے کے سینچوں
جو تو چاہتی ہے اسے آج پورا کروں

تجھے پیار ہے میرے اُس بت سے، میرے جنوں سے
تو دیوانہ وار اک نئی زندگی چاہتی ہے
مرے ساتھ تو وار کرتی ہے ان ظلمتوں پر
جہاں کھو گئے ہیں دیئے روشنی کے

جہاں خاک میں مل گئیں صورتیں کیسی کیسی
تُو یہ چاہتی ہے کہ میں زندگی کو سنواروں
تُو اس موڑ پر آ چکی ہے جہاں میں کھڑا ہوں
تو میرا سکوں ہے مری اپنی آواز ہے
مرے دل کی دنیا، مری روح کا راز ہے
ہماری نظر ایک ہے، ایک ہی جستجو ہے
ہماری نئی زندگی کا یہ آغاز ہے
ہمارا سفر ہے نئی منزلوں کی طرف
ہمارے لئے جاں فشانی کا در باز ہے
ہم عہدِ کہن کو مٹانے کی خاطر اُٹھے ہیں
محبت کو اِک تازیانہ بنانے کی خاطر اُٹھے ہیں

کراچی

غزلیں

؁۵۰ء تا ؁۶۰ء

(ترتیب وار)

آج رنگ بھی لائی، دل کی بزم آرائی
چھوٹ گیا ہے ہاتھوں سے دامنِ شکیبائی

دیدۂ محبت کی اشک ریزیاں کیا تھیں
خشک ہو گئی کیونکر دو جہاں کی پہنائی

یہ بھی اِک بہانہ تھا، تم کو آزمانے کا
ورنہ جینے والوں کو موت بھی نہ راس آئی

وہم سے گزرنا تھا، اعتبار کرنا تھا
ٹھوکریں نہ کھائے گی میری جادہ پیمائی

محو کر دیا کس نے شورِ میکدہ سارا
کس نے ہوش کھویا ہے، کس کو تیری یاد آئی

مٹ گئی ہے بے کیفی بال و پر کی ایما سے
یا نگاہ کی حسرت قسمتیں بدل لائی

سرمہ بن گئے انجم داغہائے پیشانی
کون چھین سکتا ہے سنگِ در کی بینائی

ایک سودا ہے، لذتِ غم ہے
آج پھر میری آنکھ پُرنم ہے

دل کو بہلا رہے ہیں مدت سے
زندگی کیا عذاب سے کم ہے

ذرہ ذرہ اُداس ہے اس کا
میرے گھر کا عجیب عالم ہے

مہر و مہ پر کمند پڑتی ہے
سوچ میں کوئی ابنِ آدم ہے

تجھ سے پردہ نہیں مرے غم کا
تو مری زندگی کا محرم ہے

یہ جو اک اعتبار ہے تم پر
کس قدر پائیدار و محکم ہے

کل تو دنیا بدل ہی جائے گی
آج ان کا یہ جورِ پیہم ہے

دل نہ کعبہ ہے، نے کلیسا ہے
تیرا گھر ہے، حریمِ مریم ہے

کوئی اتنا بتا دے، کیوں نہ سنبھلا جائے ہے مجھ سے
خیالِ یار تو کچھ اور اُلجھا جائے ہے مجھ سے

کیا ہے مجھ کو آوارہ مرے غم ہائے عُریاں نے
جو میرے پاس آتا ہے، وہ گھبرا جائے ہے مجھ سے

مجھے عقل و خرد کی بات سمجھاتے ہیں وہ آکر
دلِ ناداں کو سمجھائیں، کہ مچلا جائے ہے مجھ سے

ہوا ہے ضبطِ غم سے کیا مرے چہرے کی رنگت کو
خمارِ بادۂ عشرت بھی شرما جائے ہے مجھ سے

اسی آغوش میں کون و مکاں کو بھینچ لیتا ہوں
جو وداے گردشِ دوراں اقریب آجائے ہے مجھ سے

لگاوٹ ہر قدم پر، تاکہ زہرِ آگہی پی لوں
زمانہ کیا نرالی چال چلتا جائے ہے مجھ سے

بڑھا جاتا ہوں منزل کا اشارہ ہو نہ ہو انجم
ہجومِ شوق کے باعث نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

یہ دُکھ، یہ رنج، یہ آزار، عمر بھر ہی سہی
جو چل پڑے ہیں تو پھر راہ پُر خطر ہی سہی

نہ برگ و بار ہی لائی نہ شاخ پُھل ہی سکی
جئے حوادثِ پیہم میں، بے ثمر ہی سہی

کسی کی پوری ہوئی ہے یہ آرزو بھی کہاں
جو ہو سکے تو محبت کی اِک نظر ہی سہی

اب ان کے آنے تلک یہ زمانہ بدلے گا
کچھ اعتبار تو ہے، صبح و شام پر ہی سہی

تمام عمر کا وعدہ نبھا نہ پاؤ گے
لُٹاؤ جوشِ طلب میں دل و جگر ہی سہی

ہمارے دوش پہ کس واسطے جھکا تھا کوئی
لپٹ پڑے کہ نہ ہو خیر، کوئی شر ہی سہی

طلب بھی دشمنِ جاں سے گزر گئی انجم
چلو کہ آج کوئی حسنِ رہگزر ہی سہی

○

کہتے ہیں کہ میخانے میں مے عام کہاں ہے

رندوں کی یہی بات تو ساقی پہ گراں ہے

کھلتے ہی رہے وعدۂ تعمیر کے دھوکے

اے حُسنِ گل ولالہ! وہ تعمیر کہاں ہے

کس جرم میں جینے کی سزا پائی ہے میں نے

نے نکہتِ گیسو نہ کوئی نغمۂ جاں ہے

اے جانِ جہاں! جانِ تمنا! تو کہاں ہے

مدّت سے وہی چشمِ محبت نگراں ہے

کس دن کی رفاقت کا صِلہ مجھ کو مِلا ہے

آغوشِ حوادث میں بھی تھوڑی سی اماں ہے

پھولوں کی مہک لائی ہیں فردا کی ہوائیں

شوریدہ سری آج عنادل کی جواں ہے

معلوم نہ تھا فتنۂ ابلیس کا مسکن

اے مرشدِ حق بیں! تری فطرت پہ گماں ہے

سورج کی شعاعوں کے طلبگار نہیں ہم

ہر ذرّۂ خاکی میں وہی سوزِ نہاں ہے

جس خاک میں ملتا ہے لہو دیدہ و دل کا

اس خاک کے سینے پہ بہاروں کا سماں ہے

ہوئی ہے آج غموں سے ہزار دلسوزی
مزہ چکھیں گے مگر سرکشانِ عالم بھی

خزاں کی گود امید بہار سے پُر ہے
پیامِ شوق ہے صیاد کی سیہ بختی

یہ سعیٔ زیست عبادت، یہ زندگی اک جام
جو پی سکو تو حرام و حلال کچھ بھی نہیں

طلب ہے اور غمِ دو جہاں کا افسانہ
یہاں بھی ہات میں ساغر نگاہ میں رندی

مجاربات جنوں کو چراغ دکھلا دو
کہ رنگ و نور سے بھر جائے دامنِ ہستی

گھڑی ہے آمدِ فصلِ بہار کی شاید
صد انتظار میں آنکھیں ہیں لالہ و گل کی

طلسم ٹوٹ گیا آج تیرے زنداں کا
قفس میں رہ کے ہوا کارِ آشیاں بندی

بنا گئی جو مجھے بندۂ وفا انجمؔ!
وہ اک نظر تو مری عمر بھر کی دولت تھی

○

ایسے بھی کہاں ملیں گے دل جُو
اعجاز، برنگِ چشمِ آہو

اِکبار ہم اس طرح سے روئے
اُن کے بھی نکل پڑے تھے آنسو

پھرتا ہوں میں دربدر جہاں میں
کس کی ہے تلاش آج ہر سو

اپنی سی جہاں میں کر گزریئے
شل، ہوتے رہیں گے دست و بازو

دیوانہ بنا رہے ہیں، ہم کو
دنیا، یہ تیرے دراز گیسو!

ایمان ہے جن کا، رنگ و بُو پر
ٹھہرے ہیں وہی تو آج بدخُو

ٹوٹا ہے طلسمِ پاکبازی
آنکھوں میں وہ بھر کے آئے جادو

بدلا نہیں رنگ گلستاں کا
پھولوں میں کہاں سے آئے خوشبو

انجمؔ! یہ مرض نہ جا سکے گا
اب اِس کی کوئی دوا نہ دارُو

○

عالمِ وحشتِ تنہائی ہے، کچھ اور نہیں
سر پہ اک گنبدِ مینائی ہے، کچھ اور نہیں

کیوں ہوا مجھ کو عنایت کی نظر کا سودا
آج رسوائی ہی رسوائی ہے، کچھ اور نہیں

اپنا گھر پھونک چکا، اپنا وطن چھوڑ چکا
یہ فقط بادیہ پیمائی ہے، کچھ اور نہیں

ہو سکے تو کوئی فردا کی بنا لو تصویر
وقت جلووں کا تمنائی ہے، کچھ اور نہیں

آؤ خوش ہو کے پیو، کچھ نہ کہو واعظ کو
میکدے میں وہ تماشائی ہے، کچھ اور نہیں

کسی کی انجمنِ ناز میں ہُوا رُسوا
میں ایک رندِ طرب گاہِ آرزو ٹھہرا

کسی نے ہنس دیا، ساغر چھلک اُٹھا دل کا
نشہ چڑھا تو کچھ ایسا کہ پھر اُتر نہ سکا

کبھی تلاطمِ دریا، کبھی ہے حسرتِ دل
ہمارے حُسنِ طلب کو دعا سے نسبت کیا

خزاں کے سر کوئی الزام کس لئے آئے
گلے پہ بن گیا خنجر، بہار کا سودا

چراغِ راہ گزر شانِ بے نیازی سے
تمام رات ہواؤں کی زد میں روشن تھا

کہاں کے دار و رسن کشتۂ وفا کے لئے
اسے تو کوچۂ جاناں کی لگ چکی ہے ہوا

جبینِ شوق تو رکھدی ہی آستاں پہ ترے
ہوائے دل نہ اُڑا لے چلے سوئے صحرا

وہ جس کے حُسن کا شہرہ تمام شہر میں ہے
سُنا ہے انجمِ وحشی پہ مہربان ہُوا

○

ہاں، میکدے میں ہوش کا دعویٰ نہ کیجئے
یا اعتبارِ مستیٔ صہبا نہ کیجئے

مہر و وفا کو مہر و وفا جانتا ہوں میں
اتنی سی بات کے لئے رُسوا نہ کیجئے

دنیا ہی اعتبار کے قابل نہیں ابھی
دل کو حریفِ وعدۂ لیلیٰ نہ کیجئے

ہو جایئے حقیر خود اپنی نگاہ میں
اتنا کبھی دماغ کو اُونچا نہ کیجئے

ہنگامِ لطف و عہدِ مسرّت کا واسطہ
چھٹ جایئے گا، رنجشِ بیجا نہ کیجئے

کچھ ہو رہے گا میری محبّت کا مہرباں
زخمِ جگر کا آپ مداوا نہ کیجئے

میں ہوں یہاں کشاکشِ ہستی میں مبتلا
واں چُپ کھڑے ہوئے مجھے دیکھا نہ کیجئے

ملتا ہے اور انجمِ دیوانہ کس جگہ
جُز میکدہ اُسے کہیں ڈھونڈا نہ کیجئے

اس ڈر سے آنہ جائے جدائی کی رات پھر
کٹتی نہیں ہیں وصل کی شب ہائے رنگ رنگ

ہم سادہ لوگ مست ہیں اپنی گلیم میں
اہلِ ہوس کو چاہیئے دیبائے رنگ رنگ

رندانِ میکدہ کو تو اتنا ہی ہوش ہے
ساغر میں ڈھال لیتے ہیں صہبائے رنگ رنگ

صحرا کی خاک چھانتے پھرتے تھے جو کبھی
بھر لائے جھولیوں میں گُہر ہائے رنگ رنگ

رشکِ بہارِ حافظ و غالب جو بن سکیں
کھلتے ہیں اِس چمن میں وہ گلہائے رنگ رنگ

زندگی کیا تھی، شرر کا رقص تھا
حشر اک اُٹھا تھا، وہ بھی ختم گیا

آگ سینے میں لگی تھی اِس قدر
میری ہر ہر سانس سے شعلہ اُٹھا

زندگی کا یہ بھی اِک احسان ہے
جب بھی دیکھا، دل ہمارا زخم تھا

کیسی دل کی بے خودی، کیسا جنوں؟
اُن کے جاتے ہی مجھے ہوش آگیا

ہم ہیں سرگرمِ تقاضائے طلب
دور ہے منزل تو اس سے کیا ہوا

تم نہیں ہو، زندگی کے غم تو ہیں
اتنے پیارے دن بھی کٹ جائیں گے کیا

کب تلک روتا کوئی، اے ہجرِ یار!
میں بھی آخر روتے روتے ہنس پڑا

عمر بھر مانندِ موجِ بے قرار
انجمؔ شوریدہ سر مضطر رہا

○

فریبِ غم ہی سہی، دل نے آرزو کرلی
بُرا ہی کیا ہے، اگر تیری جستجو کرلی

غلط ہے، جذبۂ دل پر نہیں کوئی الزام
خوشی ملی نہ، ہمیں جب تو غم کی خو کرلی

بٹھا کے سامنے تم کو بہار ہیں پی ہے
تمہارے رند نے توبہ بھی روبرو کرلی

وفا کے نام سے ڈرتا ہوں، اے شہِ خوباں!
تم آئے بھی تو نظر جانبِ سبو کرلی

کہاں سے آئیں گے انداز بے پناہی کے
ابھی سے جیبِ تمنا اگر رفو کرلی

زمانہ دے نہ سکا فرصتِ جنوں انجمؔ!
بہت ہوا تو گھڑی بھر کو ہائے ہُو کرلی

○

جز واعظانِ شہر، ہر اِک تشنہ کام ہے
مُلّا ئیت کے دیس میں رندی حرام ہے

ہر رند کو پلائے، یہ ساقی کا کام ہے
ایسا اگر ہے، تب تو وہ عالی مقام ہے

پہلے پہل جو تیری نظر سے ہوا شروع
وہ قصّۂ جنوں تو ابھی ناتمام ہے

کچھ کچھ پسند میں بھی اُنہیں ہوں جبھی تو آج
اِس طرح ناز سے کوئی بالائے بام ہے

اِک اِک قدم پہ ملتا ہے میری جبیں کا نقش
اس سرزمیں کا کوچۂ دلدار نام ہے

مدّت ہوئی کہ لب پہ بھی آیا نہ تیرا نام
بدنام ہوں، کہ تجھ سے پیام و سلام ہے

کہتے ہیں جس کو سرو، وہ تیرا دراز قد
کہتے ہیں جس کو چال، وہ تیرا خرام ہے

ہوش و خرد شکار ہیں، اے بیخودیٔ شوق!
تو میکدے میں آج بھی شعلہ بجام ہے

رُکتا کہاں ہے قافلۂ شوق راہ میں
دیوانگانِ عشق پہ منزل حرام ہے
ہر لمحہ اک جنوں سے عبارت ہے زندگی
ہر لمحہ بیقراریٔ رقصِ دوام ہے
کیا ہے جو ہم نے ہوش نہ کھویا ترے لئے
اس رسم سے الگ ہی سہی، جو کہ عام ہے
وہ انجمؔ خراب، جو رندوں کے ساتھ ہے
سنتے ہیں میکدے میں وہ ان کا امام ہے

ہمیں تو لالہ و گُل اب بھی سوگوار ملے
جو خونِ دل نہ جلاؤ تو کیا بہار ملے

یہ کیا کہ زخمِ جگر، چشمِ انتظار ملے
ملے تو صحبتِ حورانِ گلعذار ملے

کہیں تو پہنچیں، یہ صحرا نورد یاں کب تک
وہ میکدہ ہی سہی، گر نہ کوئے یار ملے

زباں دراز ہے اتنی ابھی زمانے کی
کہ جو کیا بھی نہ تھا اس کے اشتہار ملے

گلوں کا حُسن، صبا کا خرام، رنگِ چمن
ہر اک ادا میں تری مستیٔ بہار ملے

ہیں تیرے شہر میں کچھ تو معلّمِ اخلاق
جنہیں یہ فکر کہ دامن نہ داغدار ملے

ہماری طرح جو مستِ الَست رہتے ہیں
انہیں نہ حلقۂ رنداں، نہ کوئے یار ملے

بتاؤ تم نے بھی ان میں کسی کو چاہا ہے
تمھارے چاہنے والے تو بے شمار ملے

کسی کو پایا ہے ہم نے جو بے مثال انجم!
قرار کھو کے ملے، اس سے، بار بار ملے

○

بزمِ خوباں سے پرے، کوچۂ جاناں سے ہیں دور
وصل کیا خاک ہو جب یہ ہے جنوں کا دستور
اُن سے اَب کرتے نہیں کوئی ملاقات، مگر
ہم ہوئے جاتے ہیں اِس طرزِ وفا پر مغرور
ہر قدم، کوئی فسوں، تازہ بتازہ، لیکن
ایک ہم ہیں کہ ہمیں یہ بھی نہیں ہے منظور
اِن دنوں حرفِ تمنا پہ مٹے جاتے ہیں
ہم سے مت پوچھ، کہ یوں بھی ہمیں ملتا ہے سرور
دل لگی جس کو سمجھتا تھا وہ شے کیا نکلی
پڑ گئے آج مرے زخمِ جگر میں ناسور
حسرتِ دید کے قائل ہی نہیں ہیں ہم لوگ
جلوۂ یار کا سودا ہے تو دیکھیں گے ضرور
دن میں کیا ڈھونڈتے ہو، انجمِ مستانہ کو
رات آتی ہے تو میخانے میں ہوتا ہے ظہور

کھیل سمجھا تھا نگاہوں کا جسے
تیر پہنچا ہے وہی تا بہ جگر

نجد میں قیس کے شاگرد ابھی
ڈھونڈتے پھرتے ہیں آہوں میں اثر

آسماں ہوگا، زمیں بھی ہوگی
گھر نہ ہوگا تو رہیں گے بے گھر

سر اُٹھانے کی بھی فرصت نہ ملی
زندگی گزری یونہی خاک بسر

بزمِ میخانہ ہے مستی کا نظام
دیکھتے کیا ہو اُٹھا لو ساغر

جا کے آباد صنم خانوں میں
ہم نے دیکھا ہے جمالِ آذر

وادیٔ عشق میں رکھا ہے قدم
کہکشاں ہوگی مری راہ گزر

وہ جھکاتے ہیں حیا سے نظریں
پھول کھل جاتے ہیں رخساروں پر

دل میں ناصح کے بقولِ انجمؔ
کیوں بھلا ہوگا خرابات کا ڈر

دیکھیئے کس طرف چلے بارِ حیات اُٹھا کے ہم
گردشِ روزگار کو خونِ جگر پلا کے ہم
چھوٹ گئی نماز اگر، کون سا جُرم ہو گیا
بندے ہیں سادہ اور نیک یوں بھی ترے خدا کے ہم
مائلِ التفات ہے تری وفا ابھی مگر
خوش ہیں تری نگاہ سے اپنی نظر بچا کے ہم
ختم ہوئی شبِ وصال، آئی فراق کی گھڑی
لوٹے حریمِ یار سے آنکھوں کی نیند اُڑا کے ہم
شوقِ وصال بھی نہیں، کوئی ملال بھی نہیں
جانی! وہ حال بھی نہیں بھُوکے نہیں وفا کے ہم
جانے کدھر کو چل دیا انجمؔ بے دماغ آج
چھوڑ گئے تھے کل اُسے تیری گلی میں لا کے ہم

○

میری دنیا میں ابھی رقصِ شرر ہوتا ہے
جو بھی ہوتا ہے باندازِ دگر ہوتا ہے

بھول جاتے ہیں ترے چاہنے والے تجھ کو
اس قدر سخت یہ ہستی کا سفر ہوتا ہے

اب نہ وہ جوشِ وفا ہے، نہ وہ اندازِ طلب
اب بھی لیکن ترے کوچے سے گزر ہوتا ہے

دل میں ارمان تھے کیا عہدِ بہاراں کے لئے
چاک گل دیکھ کے اب چاک جگر ہوتا ہے

ہم تو ہنستے بھی ہیں جی جان سے جانے کے لئے
تم جو روتے ہو تو آنسو بھی گہر ہوتا ہے

سینکڑوں زخم اُسے ملتے ہیں اس دنیا سے
کوئی دل تیرا طلب گار اگر ہوتا ہے

قافلہ لٹتا ہے جس وقت سرِ راہ گزر
اُس گھڑی قافلہ سالار کدھر ہوتا ہے

انجمؔ سوختہ جاں کو ہے خوشی کی اُمید
رات میں جیسے کبھی رنگِ سحر ہوتا ہے

○

دہر میں پھرتا ہے جوں بادِ صبا مستانہ
تیرے دیوانے کا انداز ہر اک رندانہ

شوق کے پھول کِھلے، حُسن کی قندیل جلی
سج گیا آپ کے آتے ہی مرا کاشانہ

چاہتا ہوں کہ یونہی محوِ تماشا ہو کر
جلوۂ حسن کو دیکھا کروں بیباکانہ

جاں نثارانِ محبت کا پتہ دیتی ہے
شمع پہ بکھری ہوئی خاکِ دلِ پروانہ

غم سے جو ہار گئے سوئے حرم جا نکلے
زندگی ڈھونڈنے والوں کو مِلا میخانہ

آج کی رات تو جی بھر کے ہمیں پینے دو
آج کی رات تو گردش میں رہے پیمانہ

ذکر چھڑ جاتا ہے، جب انجمِ وحشی کا کبھی
ہنس کے کہتا ہے کوئی "وہ ہے ترا دیوانہ"

اپنے قابو میں نہ دن اور نہ رات
زندگی عہدِ جنوں کی سوغات

زندگی ہنس کے ادھر سے گزری
تھی جہاں موت لگائے ہوئے گھات

اب کے آجاؤ تو ڈھل جائیں گناہ
اب کے آئی ہے غضب کی برسات

آمدِ فصلِ بہاراں کے طفیل
دل ملے دل سے، ملے ہات سے ہات

آرزو، اور غمِ پنہاں کی
ہم ترے شہر میں لائے بارات

عشق پھر دار و رسن تک پہنچا
کھا گیا ہوش جنوں سے پھر مات

کہہ دو بے خوف زمانے بھر سے
لب تک آجائے اگر کوئی بات

ہم ہوں یا انجمؔ دیوانہ ہو
کس نے پائی ہو زمانے سے نجات

○

دردجو آشکار ہے، عشق، جو بیقرار ہے
آج اُسی کی راہ میں قافلۂ بہار ہے

ہوں گی ہزار لغزشیں، ان کا مگر حساب کیا
حُسن کا یہ دیار ہے، عشق کا کاروبار ہے

کون سی آرزو مٹی، کون سا غم یہ آپڑا
جس پہ گواہ اِن دنوں دامن تار تار ہے

ساغرِ خُم بہ خُم نہیں، آج تو میکدے میں بھی
گردشِ جام سے سِوا گردشِ روزگار ہے

دامن دل کشاں کشاں، کھینچ رہا ہے کون آج
کوئی جمالِ دلنشیں، یا کوئی لالہ زار ہے

شمس و قمر ہیں راہ میں، اہلِ جنوں کا کارواں
آج کدھر نکل پڑا، کون سی رہ گزار ہے

انجم خستہ کیا گیا، ایک چمن اُجڑ گیا
ایک ختن اُجڑ گیا، دشت ہے یا غبار ہے

○

اُٹھی ہے موج مے جسے ساقی گھٹا کہے
ساغر میں آفتاب کہیں ڈھل گیا، کہے

اے شیخ! ایک سادہ مسلماں کے سامنے
دستِ دعا اُٹھا، کہ تجھے بے ریا کہے

عائد ہے ایک فرض، ابھی تک ہر ایک پر
جو ماورائے عقل ہو، اُس کو خدا کہے

عہدِ شباب نام ہے کس اضطراب کا
کیا بات ہے جو گرمیٔ رفتارِ پا کہے

ہر اک بقدرِ ظرف سمجھتا ہے دہر کو
زنداں کوئی کہے، تو کوئی میکدہ کہے

علم و ہنر سے عشق کو اُمید کچھ نہیں
کھُلتا ہے راز، جب کوئی بے آسرا کہے

بس یہ کہ غم بھی ساتھ ہوس کے تھا کچھ دنوں
کوئی فسونِ عشق کو اب اور کیا کہے

صحنِ چمن میں خاک اُڑانے سے فائدہ
تیری گلی سے لوٹ کے کچھ تو صبا کہے

کھُل جائے گا نگاہ پہ دل کا معاملہ
جَورو ستم کو کون بھلا دل رُبا کہے

جس راہ میں ملی ہے شہیدوں کو زندگی
وہ راہ ہم سے قصئہ اہلِ وفا کہے

اِک حکم یہ ہے انجمؔ دیوانہ کے لئے
اوروں کی طرح وہ بھی سزا کو جزا کہے

○

رنگِ محفل ہے کہاں، صبحِ بہاراں کی طرح
بزم سجتی ہے، مگر حسنِ گریزاں کی طرح

یاد آتی ہے تری موجِ ہوا کے مانند
دل میں چبھتی ہے مگر خارِ مغیلاں کی طرح

حکم ہے مرگِ تبسم کا عروسِ گل کو
حاکمِ وقت کی تقدیر ہے یزداں کی طرح

عمر بھر کے لئے سرشار جو کردے ایسی
مے کہاں سے کوئی لائے غمِ پنہاں کی طرح

شہر میں بھی مری وحشت کا ٹھکانا کیا ہے
دل کے ویرانے تو پھیلے ہیں بیاباں کی طرح

آگیا پاس کوئی عالمِ تنہائی میں
جی کو ٹھنڈک سی ملی، درد کے درماں کی طرح

رات تاریک سہی، رات کے صحراؤں میں مگر
کتنے مہتاب اُبھر آئے غزالاں کی طرح

زلف بردوش، ہنسی لب پہ، نگاہوں میں نشہ
کھل اٹھا چہرۂ محبوب گلستاں کی طرح

جانے کس خاک سے اُٹھا تھا تمنّا کا خمیر
آگہی لپٹی رہی گیسوئے جاناں کی طرح

تجھ سے جب چھُٹ کے ہوئے، پہلے پہل ہم تنہا
رات بھر روتے رہے، شمع شبستاں کی طرح

عِشق کے اور ہیں انداز بہت سے انجؔم!
کوئی رُسوا نہ ہُوا چاکِ گریباں کی طرح

دل سلامت، نہ گریباں ہی سلامت اپنا
چاک در چاک ہے افسانۂ اُلفت اپنا

رسن و دار سہی، پاؤں میں زنجیر سہی
رقص ہوتا ہے باندازۂ وحشت اپنا

ہم یونہی زہر بھرا جام پئیں گے کب تک
ساقیا! کھینچ بھی لے دستِ سخاوت اپنا

چین لینے نہ دیا بادِ مخالف نے مگر
ڈگمگایا نہ کبھی پائے محبّت اپنا

کم سے کم لطف و مروت کا بھرم کھل جائے
کیا بگاڑے گی بھلا تیری عداوت اپنا

آزماتے ہیں جو آدرش جواں رکھتے ہیں
خسروِ وقت سے بازوئے مشقت اپنا

آبیاری جو کروں خونِ جگر سے فن کی
کیوں غلط ہو بھلا، اندازۂ شہرت اپنا

سازشیں ہوتی ہیں کاخِ امراء میں انجم!
اب کھٹکتا ہی یہی "پیشۂ غربت" اپنا

○

در بدر پھرتا رہا چاک گریباں ہو کر
میں تھا آوارہ کہ دردِ غمِ تنہائی تھا
کتنے رُسوا تھے محبت میں تمہارے وحشی
سَر میں سَودا بھی باندازۂ رسوائی تھا
میرے سجدوں سے عبارت تھی خدائی اس کی
سنگِ در تھا کہ مرا نقشِ جبیں سائی تھا
صبح آئینۂ شبنم کے سوا کچھ بھی نہ تھی
گُل کو دیکھا کہ ابھی محوِ خود آرائی تھا
تھا تری بزم میں جب انجمِ دیوانہ بھی
یاد آتا ہے کہ کیا لطفِ پذیرائی تھا

○

ہم سے کیا، خاک کے ذرّوں ہی سے پوچھا ہوتا
زندگی ایک تماشا ہے تو دیکھا ہوتا

دیکھتے گر ہمیں، عالم کو بانداز دگر
اور ہی دشتِ جنوں میں دلِ رُسوا ہوتا

کیا کیا اہلِ محبت نے، مگر تیرے لئے
ہم نے اک صحنِ چمن اور بھی ڈھونڈا ہوتا

تم بھی ہوتے، مے و نغمہ بھی، دلِ شیدا بھی
اور ایسے میں اگر ابر برستا ہوتا

ہنس کے اک جام پلاتا کوئی دیوانے کو
پیار تو ہوتا، مگر کاہے کو سودا ہوتا

تذکرے ہوتے رہے، چاک گریبانوں کے
ہاں تری بزمِ طرب میں کوئی ایسا ہوتا

تشنہ لب کون ہے، گو جام نہ آیا ہم تک
دور اک اور چلا، خونِ جگر کیسا ہوتا

خاک نے کتنے بد اطوار کئے ہیں پیدا
یہ نہ ہوتے تو اسی خاک سے کیا کیا ہوتا

اُس سے ملنا ہی غضب ہو گیا، ورنہ انجم
دربدر پھرنے کا جھگڑا بھی نہ اُٹھا ہوتا

(۱)

عشق کو مذہب کہیں، تم کو شہِ خوباں کہیں
اک طوافِ کعبۂ دل ہے جسے ایماں کہیں

ابروؤں کا خم ہے یا شمشیر کو عریاں کہیں
حشر کا ساماں کہیں یا درد کا درماں کہیں

زلفِ جاناں کو، جو مثلِ شعلہ لہراتی رہی
گیسوئے سنبل کہیں یا کاکُلِ پیچاں کہیں

تیرا جسمِ نازنیں ہے یا بہاروں کا وطن
اور پیراہن کی خوشبو کو مشامِ جاں کہیں

کیا ترے رخسار و لب کی بھی کوئی تشبیہ ہے
پھول کے ہنسنے کو جیسے آتشِ خنداں کہیں

محرمِ رازِ محبت کون ہے تیرے سوا
دل رفیقِ جاں سہی تجھ کو تو اپنی جاں کہیں

دیکھتے ہی جس کو یاد آجائیں کچھ بچھڑے ہوئے
ہاں اسی صورت کو دل والو رخِ جاناں کہیں

وصل کی اس کے توقع ہو تو پھر کیا پوچھنا
ناامیدی ہو تو اس کو وصل کا ارماں کہیں

تیرے وحشی پر تو تجھ بن عرصۂ آفاق تنگ
کوئی صحرا ہو تو اس کو خانۂ زنداں کہیں

آگ سینے میں لگی، چاروں طرف پھیلا دھواں
درد پہلو سے اٹھا، پیدا کہیں پنہاں کہیں

کوئی قصہ اور بھی ہے انجمؔ رنگیں بیاں
قصۂ دل کے سوا جس کو بہرِ عنواں کہیں

اشعار

غمِ دنیا! تجھے دنیا کو بدلنا ہوگا
دردمندوں نے ترے ناز اُٹھائے کیا کیا
تجھ کو پاتا ہے تو دامن کی طرف کیا دیکھوں
کوئی اِس راہ میں کانٹوں سے بچائے کیا کیا

بنے ہو رند، یہ پیمانہ لے کے ہاتھوں میں
جو ہو سکے تو غمِ روزگار بھر لاؤ

جنت نہیں یہ میکدۂ سوز و ساز ہے
مے کی مثال ہے، یہاں آدم کی آبرو

کون سا وہ عالم تھا اس کے ہو بیٹھے
وحشت ہی وحشت ہے سب کچھ کھو بیٹھے

گھٹ گھٹ کے تنگنائے محبت میں رہ گئے
شعلوں کی پرورش کے بہانے کہاں نہ تھے

اُٹھ اُٹھ کے گر پڑے تھے جو گر گرکے اُٹھ پڑے
اے زندگی! وہی تو ترے رازداں نہ تھے

راستہ کٹ گیا تو یاد آیا منزلیں تھیں بہت کٹھن اپنی

آج کی شب نہ جانے دوں گا میں آج کی شب یہیں گزار و بھی

کسی کو اپنا سمجھئے تو چھوٹ جانا ہے
نگاہِ یار بھی دو دن کا اک سہارا ہے

میں نے بھی ایک شمع جلائی تھی، بجھ گئی
کتنے چراغ تو نے بجھائے ہیں اے صبا!

لب پہ آئی تھی فغاں کچھ اس طرح بیٹھے بیٹھے دیر تک رو یا کئے
کون تھا جس کی تمنا کر کے ہم صحرا صحرا آج تک بھٹکا کئے

خونِ دل اور جلاؤ، کہ چمن میں مہکے
نہ سہی عہدِ بہاراں، مگر امکان تو ہے

بتا دو مہرباں، نامہرباں میں فرق کتنا ہے
چھپا کر کس لئے لائے ہو زیرِ آستیں خنجر؟

وحشت افزا ہے تری بزم میں آنا لیکن
چاک دامن کو سمیٹے ہوئے ہم آ بیٹھے
کچھ نہ ہوگا نہ سہی، جان ہی دیتا جاؤں
آدمی کارگہِ دہر میں چپ کیا بیٹھے

حیا کی رسم اُٹھا دی ہے عشقِ رسوا نے
کفن کو چیر کے نکلے، تو کس سے شرمائے

انہیں نگاہوں سے سو بار اس کو دیکھا ہے
جمالِ یار حقیقت ہے کوئی خواب نہیں
کسی کو ہوش کا دعویٰ ہوا کرے انجم
وہ بارگاہ میں رندوں کی باریاب نہیں

تیرے عارض کی شعاعوں نے دیا تھا حوصلہ
میں اُٹھا اور بزم کے رندوں کو تڑپا ہی گیا

چمن یہ، جلوہ گاہِ ناز ہوتا   بہار آتی تو کیا غنچے نہ کھلتے

زندگی، کون سا احسان دھرے گی ہم پر
یہی کیا کم ہے کہ دُکھ سہ کے گلہ تک نہ کیا
دل تری یاد میں اس طرح تڑپتا ہے ابھی
ڈر یہ لگتا ہے کہ پہلو سے نہ ہو جائے جدا
اے خوشی! ڈھونڈنے نکلے تھے تجھے ہم لیکن
ہم میں جینے کا سلیقہ بھی تو باقی نہ رہا

وہ جمالِ نازنیں تھا یا کوئی خوابِ نظر
جانے کیا شے تھی کہ میں دم بھر میں اس کا ہو گیا
یوں بھی رسوائے جہاں تھا انجمؔ خانہ خراب
آپ کی محفل میں آکر اور رُسوا ہو گیا

حوصلے یوں بھی تھے' بے راہ روی پر مائل
آپ کی چشمِ عنایت نے بھی بہکایا ہے

مرے غزال کا وعدہ ہے شب میں آنے کا
میں اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھا ہوں

ہنسنا رونا، دو ہی ریت ہے اس دنیا کی
اس جیون کو دھوپ چھاؤں کا رنگ ملا ہے

مضطرب ہر کوئی، ہر ایک ہے آشفتہ نظر
کس سے پوچھوں کہ یہاں کون کدھر دیکھی ہے

ترا جسم ہنس رہا تھا، مری رات جاگ اٹھی تھی
مری انگلیاں بنی تھیں تیرے گیسوؤں کا شانہ

رونا ہر ایک کو ہے اگر تیرے شہر میں
ماتم کریں گے ہم بھی دل سوگوار کا

آج پورب سے گھٹا اٹھی ہے آج دل اپنا ہوا ہے بیتاب

یاد رکھنا ہی پڑیگا یہ زمانے کا چلن دل کو سمجھا تو لیا دیدۂ ترسی میں نے

سیرِ افلاک کو نکلے ہیں زمیں کے محرم
آگہی با تیرے پر و بال کی حاجت ہی ہمیں

جب بھی ٹوٹی ہے کوئی رسم وفاداری کی
راہ میں آکے ہوئی تیری وفا دامن گیر
گلفروشانِ چمن سے کوئی شکوہ بیکار
کٹتے جائیں ابھی پاؤں میں پڑتی زنجیر

کبھی تو تشنہ لبی کا یہ دور گزرے گا
یہ سوچتے ہوئے ساقی کے در سے گزرے ہیں

کسی کی جنبشِ ابرو میں اتنا زور کہاں
حریف کون تمہارا ہے، ترکمانوں میں
ٹھہر سکو تو گھڑی بھر کو ہی ٹھہر جاؤ
نئے نئے ہو ابھی دل کے میہمانوں میں

تھی صبح کے ہنستے ہوئے چہرے کی تمنّا
اب سلسلۂ گردشِ ایّام بہت ہے

تجھ سے روٹھنے والے میکدے میں بیٹھے ہیں
وقت اس بہلنے سے کچھ خراب تو ہوگا
جو تری محبّت میں زندگی لٹاتے ہیں
ان کے بھی دماغوں میں کوئی خواب تو ہوگا
عمر بھر کسی کا ہم انتظار کرتے ہیں
کاروبارِ جاناں کا کچھ حساب تو ہوگا

خونِ جگر سے شمعِ محبت جلا کے ہم
جاتے ہیں لَو لگائے ہوئے کوئے یار تک

آرزو محرمِ جاں، اور زباں نامحرم
دل پہ اک جبر ہے اندوہِ شکیبائی کا

پچھلے پہر جو جلوۂ فردا مچل گیا
ہر بزم میں شراب کا اک دور چل گیا

آج ٹھکرا بھی سکا رسمِ وفا کے آداب
تیرا سودائی بھی شاید ترا سودائی نہیں

مٹ گئے جرمِ عاشقی میں ہم　　　سامنے کوئی مرحلہ نہ سہی

اُداس اُداس ہوں شام و سحر تو کیا کیجے
کہ دوستی میں کبھی دشمنی نہیں ہوگی

وہی پیمانِ وفا یاد آیا　　　جو مرے غم کا نگہبان ہوا

رُباعیات

آوارۂ کو بکو، رہے نہ رہے
پھر اپنی یہ جستجو، رہے نہ رہے
اِک بار تو اُس کے پاس ہو آؤں میں
اس کوچہ میں آبرو رہے نہ رہے

خورشید سے ذرّوں کو کریں روشن تر
اِمروز سے فردا کو بنائیں بہتر
ہر سمت سے اُٹھتی ہے صدائے بیباک
اک تازہ جہاں آب و گل سے پیدا کر

سورج کی شعاعوں کو کیا جس نے اسیر
خود عالمِ امکاں میں چلا بے زنجیر
ظلمت میں ہوا جس سے اُجالا ہر سو
کس خاک سے اُٹھا ہے اس انساں کا خمیر

دن رات وہی کتابی مالا جپنا
"خشکی" میں کسی کے جان و دل کا تپنا
کیا کیا نہ بھرم تھے آج کھل جائینگے سب
ٹوٹا ہے غرور علم و دانش اپنا

اب ختم ہوئی بادیہ پیمائی مری
لے آئی کہاں کھینچ کے خود رائی مری
یہ کونسی منزل ہے خدایا، میرے
آنکھوں سے چھنی جاتی ہے بینائی مری

مدت سے بسا رہا تھا اک باغ ارم
محفل میں چھلک رہا تھا ساقی کا کرم
مظلوم ہوس کی بات لگتی ہے، مگر
برسوں کی وفا کا آج کھلتا ہے بھرم

ہستی کو حباب کہہ کے کیا پاؤ گے
دنیا کو خراب کہہ کے کیا پاؤ گے
منجدھار میں ہات پاؤں مارو تو سہی
دریا کو سراب کہہ کے کیا پاؤ گے

پیتا ہوں شراب، مجھ کو پینے دو ابھی
مانگوں، تو حسین آبگینے دو ابھی
کٹتے ہیں یونہی جو دن تو کٹ جاتے دو
جینے کا سہارا ہے، تو جینے دو ابھی

لب پر نہ فغاں ہے، نہ فریاد رہے
کیوں قیس کی طرح کوئی برباد رہے
ان آنکھوں سے قطرہ قطرہ ٹپکو کر آنسو
دیوانۂ غم والم سے آزاد رہے

ہے کتنی سیاہ رات، چھائی ہے گھٹا
ملنے کو فلک پہ ہے فرشتوں کو سزا
اے جان! لپٹ کے مجھ سے سوجا اس وقت
ہے غیظ و غضب میں دونوں عالم کا خدا

ہر بار خزاں کے بعد آئی ہے بہار
امروز کے غم کو بھی ہے اک لمحہ قرار
لاتے ہیں یہ صبح و شام صدیوں کی خبر
امید برس رہی ہے بن بن کے پھوار

پردوں میں چھپا ہوا تھا میرا آہنگ
مجھ پر نہ ابھی عیاں تھی ہستی کی ترنگ
وہ دور گزر گیا، تب آیا ہے یہ دور
بھرتا ہوں میں خونِ دل سے تصویر میں رنگ

کہتے ہیں، دل و جگر کی قیمت کیا ہے
دیوانوں کی اس جہاں میں عزت کیا ہے
ہے جس پہ نثار دین و دنیا سب کچھ
بڑھ کر اُس پیار سے اور دولت کیا ہے

اِس بزم میں ساغر ابھی چھلکانا ہے
اس شوخ کی زلفوں کو بھی لہرانا ہے
اے جراَتِ رندانہ! مدد کر میری
دو دن میں اگر خاک میں مِل جانا ہے

ہنس ہنس کے دیے جلاؤ اے اہلِ جنوں!
ظلمت کی ہنسی اڑاؤ، اے اہلِ جنوں!
زنداں ہو تو حُریت کے نغمے گاؤ،
مقتل ہو تو سر کٹاؤ اے اہلِ جنوں!

ساقی یہ شراب ارغواں دیتا جا
دنیائے نشاط و جمال جاں دیتا جا
تو ہی وہ خدا ہے جس کو سجدہ ہے روا
سجدوں کو حیاتِ جاوداں دیتا جا

مصنّف کی کتابیں

۱- لب و رُخسار (عشقیہ نظمیں) قیمت -/۱/-۲ طبع اول ۵۲ء

۲- لہو کے چراغ (شعری تخلیقات) قیمت -/۱/-۴ " جنوری ۶۱ء

۳- غالب کی اردو شاعری (تنقید) زیر طبع ——————

کراچی آرٹ اکیڈیمی کا آئندہ اشاعتی پروگرام

۱۔ کراچی کے تین نئے ادیب ——— ترتیب ——— انجم اعظمی
۲۔ شبلی بحیثیت اردو شاعر (تنقید) محترمہ خورشید احسن صدیقی
۳۔ طلوعِ سحر (مجموعہ کلام) ——— سحر انصاری
۴۔ خود نوشت سوانح ڈوراڈنکن (ترجمہ) ——— خلیق ابراہیم

''انجم اعظمی کا شمار اردو کی نئی نسل کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے- ۵۲ء میں انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے اردو ادبیات میں ایم - اے- کا امتحان اول درجے میں پاس کیا - اور کامیاب طلباء میں بھی اول رہے- اسی سال ان کی عشقیہ نظموں کا ایک مختصر مجموعہ ''لب و رخسار،، علی گڈھ والوں نے شائع کیا جو اردو کی عشقیہ شاعری میں ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے-

ان کے ہاں موضوع کے تنوع کے ساتھ ساتھ ہئیت کے تجربے بھی ملتے ہیں- لیکن ان کے تجربے فن کی روایت کا ایک حصہ بن جاتے ہیں شعر و ادب میں وہ کسی ایسی بغاوت کے قائل نہیں جس کا تعلق روایت سے نہ جوڑا جاسکے- ان کی شاعری میں تازہ ترین فکر اور جدید ترین انداز بیان ملتا ہے- غزل ہو یا رباعی، پابند نظم ہو یا نظم آزاد ہر ایک سے جدت اور فنی پختگی کا ثبوت ملتا ہے- ان کا اپنا منفرد لہجہ ہے جو مجاز، سردار، فیض اور دوسرے شعراء سے بالکل الگ ہے- اس اعتبار سے اس مجموعے کی بڑی اہمیت ہے- خصوصاً میرا گاوں، گناہ آدم خاکی، گلبانگ جرس، دیوداس اور ''محبت ہے اک تازیانہ،، جیسی معرکۃ الارا نظمیں اس میں شامل ہیں جن کی وجہ سے اس کتاب کو جدید شاعری کی بہترین کتابوں کی صف میں بہر حال جگہ دینی ہوگی،،-

پروفیسر عبدالسلام
سنٹرل گورنمنٹ کالج ناظم آباد - کراچی